جلد ۸۲ نومبر ۱۹۷۴ء عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۳	نومبر ۱۹۷۴ء مطابق شوال ۱۳۹۴ھ	جلد ۸۲

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک ، اچھرہ - لاہور

زرسالانہ بارہ روپے - فی پرچہ ۱/۲۵ روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

پرنٹر : محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

جرمنی کے مشہور ڈکٹیٹر اڈولف ہٹلر کی زندگی اور اس کے افکار و نظریات پر یوں تو متعدد کتب شائع ہو چکی ہیں مگر چند سالوں سے ماہرینِ نفسیات اس آمر کے نفسیاتی تجزیئے میں منہمک ہیں اور اپنی تحقیقات کے نتائج وقتاً فوقتاً رسائل و جرائد میں پیش کرتے رہتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں ایک نامور محقق (WALTER LANGER) نے (THE MIND OF ADOLF HITLER) (اڈولف ہٹلر کا ذہن) کے نام سے ایک نہایت ہی دلچسپ کتاب لکھی ہے جس کی دنیا کے علمی حلقوں میں اچھی خاصی پذیرائی ہوئی ہے۔ مصنف کا اس کتاب کے بارے میں یہ دعویٰ ہے کہ اس نے اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں اُن خفیہ رپوٹوں سے استفادہ کیا ہے جہاں دوسرے اہل علم کی رسائی ممکن نہ تھی۔

اس کتاب کے مطالعہ سے جہاں ہٹلر کی زندگی کے بعض مستور گوشے بے نقاب ہو کر سامنے آتے ہیں وہاں ایک آمر کے ذہن، اس کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل اور اس کی مجنونانہ حرکات کو سمجھنے میں بھی اچھی خاصی مدد ملتی ہے اور ایک انسان اس کی بظاہر حیرت انگیز انقلابی سرگرمیوں اور اصلاحی کاوشوں کے محرکات اور اُن کے اخلاقی اور جذباتی پس منظر کو بخوبی سمجھ سکتا ہے ہم ان صفحات میں اس کتاب کا تفصیلی تعارف پیش کر رہے ہیں۔ اس سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اس ملک کے باشندے ان غلط رجحانات سے واقف ہوں جو کسی آمرانہ ذہن کے اندر بالعموم پرورش پاتے ہیں اور اس طرح ان خوفناک نتائج سے بھی باخبر ہوں جن سے اندھی بہری آمریت کسی ملک اور قوم کو دوچار کرتی ہے۔ ہم یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ جس ہٹلر کو یہاں زیرِ بحث لایا جا رہا ہے وہ کسی مخصوص شخصیت کا نام نہیں بلکہ اس بیمار ذہنیت کا نام ہے جو المانیہ کے اس آمر کے علاوہ دوسرے بے شمار بگڑے ہوئے لوگوں کے

اندر بھی پائی جاتی ہے۔ اِن میں اور ہٹلر میں اگر کچھ فرق ہے تو وہ صرف یہ کہ جرمنی کے مخصوص سیاسی حالات اور اِس شخص کی بے پناہ قوتِ ارادی نے آمریت کی ساری ستم رانیوں کو نمایاں کر کے رکھ دیا ورنہ جہاں تک ہٹلر کی غلط ذہنیت کا تعلق ہے وہ تو بے شمار لوگوں کے اندر پائی جاتی ہے۔

کتاب کے فاضل مصنّف نے ایک ماہرِ نفسیات کی حیثیت سے سب سے پہلے ان عوامل کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے جنہوں نے ہٹلر کی ذہنیت کے اندر خوفناک بگاڑ پیدا کیا۔ علاوہ اور بہت سے اسباب کے وہ ہٹلر کے والد اور والدہ کی باہمی ناچاقی اور والد کی بُری عادات کی وجہ سے گھریلو ماحول میں راحت اور سکون کے فقدان کو ہٹلر کی ذہنی علالت کی وجہ قرار دیتا ہے۔ مزید برآں اس کے جسم کے اندر چند نقائص اور ایک آدھ عضو کی کمی کی بنیاد پر وہ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ہٹلر کی طبیعت میں تندی و تیزی کا جو پہلو سب سے نمایاں نظر آتا ہے وہ اس کے جسمانی سقم کا نتیجہ ہے۔ اس موضوع پر صرف اس مصنّف نے ہی نہیں بلکہ بہت سے دوسرے ماہرین نفسیات نے بھی اظہارِ خیال کیا ہے اور اس ضمن میں ان کے مابین کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ خود اس کتاب کے آخر میں رابرٹ جی۔ ایل ویٹ نے اس نفسیاتی مطالعے پر جو متوازن تبصرہ کیا ہے اس میں بھی اس نے ان اسباب کی اثر آفرینی پر اچھی خاصی لے دے کی ہے۔ چونکہ بحث کا یہ حصہ ہمارے موضوع سے خارج ہے اس لیے ہم اپنی گزارشات اُس غلط ذہنیت کے چند خارجی مظاہر تک محدود رکھنا چاہتے ہیں جو کسی آمر کے طرزِ عمل میں بالعموم دیکھے جاتے ہیں۔

آمریت درحقیقت کسی انسان کے دل میں خدا بننے کی دبی ہوئی آرزو کا عملی اظہار ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایک انسان فطرتاً جس بات کے اہل نہ ہو اور وہ اپنی فطری حدود کو پھلانگ کر ایک ایسی روش اختیار کرنے کی جسارت کرے جو اسے کسی طرح بھی زیب نہ دیتی ہو تو وہ اگر مجنونانہ حرکات نہ کرے گا تو کیا کرے گا۔ آمر بھی چونکہ اپنے اصل مقام یعنی مقامِ بندگی سے تجاوز کر کے اپنے آپ کو مقامِ عبودیت پر فائز کرنے کی کوشش کرتا ہے اس لیے اس کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل دونوں میں اختلال کے علاوہ نہایت ہی بھونڈی قسم کا تصنع بھی پایا جاتا ہے اور اس کی زندگی کی مختلف کیفیات اور سرگرمیاں کسی صحت مند انسان کی نہیں بلکہ دیوانے کی تصویر پیش کرتی ہیں۔ اِن سرگرمیوں کا اگر آپ مشاہدہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کا محور ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے کہ کسی طرح آمر کی جھوٹی خدائی کو پوری نوعِ انسانی سے، اور اگر یہ بات ممکن نہ ہو تو پھر کم از کم اپنی قوم ور

اپنے اہل ملک سے تسلیم کروایا جائے۔ اس مذموم مقصد کے حصول کے لیے آمر سب سے پہلے لوگوں کے ذہنوں میں یہ باطل خیال راسخ کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ منزہ من الخطا ہے اس لیے اس کی ہر رائے سو فیصد درست، اس کا ہر قدم تمام تر صحیح اور اس کا ہر فیصلہ بالکل برحق ہے۔ بالفاظِ دیگر اس کی ذاتِ گرامی منشائے ایزدی کی واحد ترجمان ہے۔ ہٹلر اپنے بارے میں اس قسم کی باتیں اکثر کیا کرتا تھا اور وہ اپنی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کو پیغامِ ربانی سے تعبیر کرتا اور اپنے فیصلوں کو احکامِ الٰہی پر محمول کر کے لوگوں کو ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کی دعوت دیتا۔ اپنے بارے میں یہ غلط موقف اختیار کرنے کی وجہ سے ہٹلر کے اندر کس درجہ کی بے جا خود اعتمادی اور مطلق العنانیت پیدا ہو چکی تھی اس کا اندازہ ذیل کے ایک اقتباس سے کیا جا سکتا ہے:

> گذشتہ سال کے واقعات سے لے کر آج تک اُسے اپنی غیر معمولی ذہانت، اپنی جبلت یا یوں کہا جا سکتا ہے اپنے ستاروں پر بے پناہ اعتماد پیدا ہو چکا ہے۔ جو لوگ اس کے قریب ہیں وہ اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ اب وہ اپنے آپ کو ایک معصوم اور ناقابلِ تسخیر شخصیت سمجھنے لگا ہے۔ اور اس کے اس اندازِ فکر ہی سے اس کے اس طرزِ عمل کی علت معلوم ہو سکتی ہے کہ وہ کن وجوہ کی بنا پر اپنے خلاف معمولی لب کشائی یا اپنی رائے سے ذرہ بھر اختلاف کیونکر گوارا نہیں کر سکتا۔ اس کی کسی بات کی تردید ملک و قوم سے بغاوت کے مترادف ہے اور اس کے منصوبوں پر رائے زنی خواہ وہ کسی زاویہ نگاہ سے بھی کی جائے، بھیانک گناہ ہے۔ ص ۱۳۱

جب کوئی انسان اپنے بارے میں اس نہج پر سوچنے لگے تو وہ لامحالہ ایک ایسی غلط راہ پر چل پڑتا ہے جو بالآخر اسے اور اس کے وابستگان کو بربادی کے مہیب غاروں میں دھکیل دیتی ہے۔ محدود عقل اور محدود صلاحیتیں رکھنے والا آدمی جب خدا بن کر کسی ملک اور قوم کی قسمت سے کھیلنے لگے تو اس سے خیر اور بھلائی کی کیا توقع کی جا سکتی ہے؟ اگر حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی ہی سے دنیا کے مسائل صحیح انداز سے حل کیے جا سکتے تو انسان کو انبیا کے ذریعے خدا سے ہدایت اور رہنمائی کی قطعاً ضرورت پیش نہ آتی لیکن تاریخ کے طویل تجربات اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ اس نوعیت کی خود اعتمادی جس کا خمیر تکبر اور اپنی صلاحیتوں کے بارے میں مبالغہ آمیز اندازے الغرض اپنی ذات کی پرستش سے اُٹھایا جاتا ہے وہ کسی شخص کو کامرانی سے ہمکنار نہیں کر سکتی۔ ایک آمر جھوٹ سے اپنے مشن کا آغاز کرتا ہے، مکر و فریب سے اسے آگے بڑھاتا ہے اور سازشوں کے ذریعے اپنے مخالفین پر غلبہ حاصل کرتے

کی کوشش کرتا ہے۔ وہ سب سے پہلا جھوٹ تو خدا کے بارے میں بولتا ہے کہ اس عظیم ہستی نے اُسے ایک غلط کام پر مامور کیا ہے۔ ہٹلر کا مشن اس باطل تصور کے علاوہ اور کیا تھا کہ دنیا میں تفوق اور برتری کا حق صرف اس نسل کو حاصل ہے جس سے جرمن کے اصل باشندے تعلق رکھتے ہیں یا زیادہ صحیح الفاظ میں جس کا خون خود اس آمر کی رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ کیا کوئی سلیم الفطرت انسان ایک ثانیہ کے لیے بھی یہ باور کر سکتا ہے کہ خالق کائنات جو پوری بنی نوع انسان کا واحد مالک اور رازق ہے وہ ایک مخصوص نسل کے بارے میں جانبدار ہو سکتا ہے۔ ہٹلر کا غیر مسئول اقتدار چونکہ اس باطل نظریے سے سراسر وابستہ تھا اس لیے وہ اس زہر کو ہر قیمت پر اہل جرمن کے دل و دماغ میں پھیلانے پر تلا ہوا تھا۔ اس ناپاک مقصد کے حصول کے لیے کوئی معقول راستہ تو نہ تھا اس لیے غلط طرز فکر اور غلط طرز استدلال اور منفی جذبات کے ذریعے جرمن عوام کے دلوں میں دوسری نسلوں اور قوموں کے خلاف نفرت و حقارت کے بیج بو کر اپنی نسل کی برتری اور اس کے اس "محسن" کی غیر معمولی عظمت کا نقش ابھارنے کی کوشش کی گئی۔ ہٹلر کا یہ غلط موقف اسی صورت میں صحیح ثابت ہو سکتا تھا جب یہ فرض کر لیا جاتا کہ صرف وہی اور اس کے ہم خیال لوگ صحیح اور برحق ہیں اور اس کی ہاں میں ہاں ملانے سے گریز کرنے والے غلط کار، بدباطن اور ملک و قوم کے دشمن ہیں۔ جذبات کے ہجوم میں جب لوگوں کے اذہان مفلوج ہوں تو وہ دشمن سے لڑنے بھڑنے کے لیے اس شخص پر مکمل بھروسہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں جو انہیں عقل کی بات سمجھانے کے بجائے اپنی چرب زبانی اور لاف گزاف کے ذریعہ ان کے جذبات کو بھڑکانے میں مہارت تامہ رکھتا ہو اور قوم کو تعمیر و ترقی کے راستے پر گامزن کرنے کے بجائے اس کی کمزوریوں سے بھرپور فائدہ اٹھا کر انہیں اپنی غلامی میں گرفتار رکھنے کے سارے ڈھنگ جانتا ہو۔ کسی قوم کا حقیقی مصلح اور بہی خواہ اس کی نبضوں پر اس لیے ہاتھ رکھتا ہے کہ وہ اس روگ کا پتہ لگائے جو اسے اندر ہی اندر گھن کی طرح کھا رہا ہے اور پھر اسے دُور کرنے کی فکر کرے۔ ظاہر بات ہے کہ اس تعمیری انداز پر سوچنے والے قائدین کسی قوم کے بگڑے ہوئے ذوق کی تسکین کا سامان تو فراہم نہیں کر سکتے بلکہ انہیں ہمیشہ یہ فکر دامنگیر رہتی ہے کہ کسی طرح قوم کے بگڑے ہوئے ذوق کو درست کیا جائے اور اسے جو اخلاقی عوارض لاحق ہیں ان سے اسے نجات دلائی جائے۔ اس لیے وہ دوا اور پرہیز کے علاوہ اُن ساری تدابیر کو سامنے رکھتے ہیں جن سے بیماری بڑھنے کے بجائے کم ہو اور اخلاقی اور ذہنی امراض کی شکار قوم جلد از جلد شفایاب ہو سکے۔

کسی قوم کے ان مخلص معالجین کے برعکس اس کی گردنوں پر ہمیشہ مسلط رہنے کی ناپاک آرزو رکھنے والے

آمر بھی قوم کی نبضوں پر فنی مہارت کے ساتھ ہاتھ رکھتے ہیں اور اس کے دل کی دھڑکنوں کو غیر معمولی توجہ سے سُنتے ہیں مگر ان کا مقصد یکسر مذموم ہوتا ہے۔ وہ کسی قوم کے عوارض کی اس غرض سے تشخیص نہیں کرتے کہ انھیں دُور کرنے کی فکر کی جائے بلکہ وہ ان کا کھوج اس لیے لگاتے ہیں کہ ان عوارض نے قوم کے اعضاء و جوارح میں جو بگاڑ پیدا کر رکھا ہے اس سے خوب فائدہ اُٹھا کر اُن میں مزید فساد پیدا کیا جائے تاکہ قوم بالکل مضمحل ہو کر رہ جائے اور اس کے اندر ظلم و استبداد کے خلاف آواز بلند کرنے کی قطعاً کوئی سکت باقی نہ رہے۔

زیر تبصرہ کتاب کے مصنف نے بڑی دیدہ دری سے اس موضوع پر بحث کی ہے اور جس چیز کو عام لوگ ہٹلر کی طلاقت لسانی سے تعبیر کر کے اسے خراج تحسین پیش کرتے ہیں اس نے اسے فنکارانہ عیاری پر محمول کیا ہے۔ اس کا خیال یہ ہے کہ ہٹلر مختلف اجتماعات کو اس لیے خطاب نہیں کیا کرتا تھا کہ وہ ان کے سامنے کوئی تعمیری پروگرام پیش کرے بلکہ اس کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ عوام کے رجحانات کا جائزہ لگا کر یہ دیکھے کہ انھیں کن حربوں سے بہکا کر کامیابی کے ساتھ اپنے پیچھے لگایا جا سکتا ہے۔ اسے ان جلسوں میں شریک ہونے سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ پہلی جنگ عظیم میں شکست کھانے کے بعد جرمن قوم کے ہاتھ سے فہم و تدبر کا دامن چھوٹ گیا ہے اور وہ اپنے آپ کو جذبات کی شعلہ فشانیوں میں جلانے پر مصر ہے۔ اس موقع پر اگر اس قوم کا کوئی حقیقی بہی خواہ سامنے آتا تو وہ اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر اس کی رہنمائی کرتا کہ یہ صورت حال صرف اہل جرمن کے ساتھ مخصوص نہیں۔ دنیا کی ہر حوصلہ مند قوم جب شکست کھاتی ہے تو وہ لازمی طور پر کچھ دیر کے لیے جذباتی بن جاتی ہے اور شکست کو فتح سے بدلنے کے لیے بعض ناقابلِ عمل تدابیر اختیار کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کے اندر بالکل فطری طور پر اپنے دشمنوں کے خلاف شدید تلخی پائی جاتی ہے بلکہ بسا اوقات وہ اپنے دوستوں سے بھی اس لیے خفا ہو جاتی ہے کہ انھوں نے اس کی توقعات کے مطابق آڑے وقت پر اس کی دستگیری نہیں کی۔ اس جذباتی فضا میں جو شخص بھی دشمن کو گالیاں دینے میں جس قدر جری اور بیباک ہو گا اور اپنے بعض حلیفوں کے بارے میں سوءظن پیدا کرنے میں طاق ہو گا، قوم اس پر جان نثار کرنے پر تیار ہو گی اور اس کے مقابلے میں جو فرد یا گروہ اسے عقل کی بات سمجھائے گا اور اس کے اندر اپنے اور غیروں کے خلاف نفرت کے شدید جذبات برانگیختہ کرنے کے بجائے اسے اپنی خامیوں اور کمزوریوں پر غور کر کے انھیں دُور کرنے کی تلقین کرے گا قوم اسے اپنا سب سے بڑا دشمن خیال کرے گی۔

ہٹلر نے اپنی خدائی کا سکہ چلانے کی غرض سے مثبت اور تعمیری انداز فکر اختیار کرنے کے بجائے تخریب کی راہ اختیار کی اور اس کے جذبات کے اندر اعتدال پیدا کر کے اور اس کی فکری قوتوں کو بروئے کار لانے کے بجائے اُس کے جذبات کے اندر مزید حدت پیدا کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری قوم پر دیوانگی کی کیفیت طاری ہوگئی اور ہٹلر کو اپنی کبریائی تسلیم کروانے میں کسی خاص مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔

اگر ایک شخص افیون کھانے کا عادی ہے تو اس کے بارے میں دقت تو اس کے اس غمگسار کو پیش آتی ہے جو اُسے اس بُری عادت سے نجات دلانے کا آرزومند ہے۔ اس مریض کا حقیقی خیرخواہ تو اس کی جلی کٹی بھی سُنے گا، اس کے غیظ و غضب کا نشانہ بھی بنے گا مگر اس کے باوجود وہ ہمیشہ اس بات کے لیے کوشاں رہے گا کہ کسی طرح یہ بدنصیب شخص چنیا بیگم کے اثر سے آزاد ہو جائے اور اپنی اس کوشش میں اس کا وہی حشر ہوگا جو دریا کے بہاؤ کے مخالف تیرنے والے کا ہوتا ہے۔ لیکن اِس شخص کے سارے بدخواہ برابر اس تاک میں رہیں گے کہ کسی طرح یہ آفت زدہ شخص اس لت سے چھٹکارا نہ پا سکے بلکہ افیون سے گزر کر شراب کا رسیا ہو تا کہ عقل و فہم کے مفلوج ہونے کے علاوہ اس کے حواس بھی مختل ہو جائیں اور وہ ایک زندہ لاش کی حیثیت سے ان کے سامنے بالکل بے بس ہو کر اپنی حیات مستعار کی چند گھڑیاں گذارنے پر مجبور ہو۔

کسی آمر کے لیے قوم کی جو چیز سب سے بڑی وجہ اضطراب بنتی ہے وہ اس کی فکری بیداری ہے اور اس کے جس طرزِ عمل سے وہ مسرور اور دلشاد ہوتا ہے وہ اس کی سطحی جذباتیت ہے اگر قوم ذہنی اعتبار سے چاق چوبند ہو اور وہ ملکی معاملات کی صحیح سمجھ بوجھ رکھتی ہو تو پھر کسی شخص کو تخت اقتدار پر متمکن ہونے اور متمکن رہنے کے لیے خلوص اور فہم و تدبر کی وافر مقدار کے علاوہ تحمل، بردباری، حق و صداقت سے گہری محبت، تعمیری ذہن اور مضبوط قوت ارادی کی بھی اشد ضرورت ہوتی ہے اور جس فرد میں یہ صفات مفقود ہوں مگر وہ اقتدار کا بھی حریص ہو تو اسے اپنے مقصد کے حصول کے لیے قوم پر دیوانگی کا عالم طاری کرنا پڑتا ہے اور اس کا راستہ ایک ہی ہے کہ ایک طرف تو قوم کو ٹھوس حقائق کی دنیا سے نکال کر خواب و خیال، جھوٹی آرزوؤں اور خام تمناؤں کی دنیا میں آباد کیا جائے اور دوسری طرف اس کے جذبات میں اس قسم کے خوفناک طوفان اُٹھائے جائیں جن میں اُن کی عقل بالکل ناکارہ ہو کر رہ جائے یا اس کے اندر اس کی کوئی احتیاج باقی نہ رہے۔

آمر اس مقصد کے حصول کے لیے کئی ایک حربے اختیار کرتا ہے جن میں بعض کی اثر آفرینی مسلّم ہے۔
ان حربوں میں سب سے پہلا حربہ یہ ہے کہ ہر آمر زبان کے استعمال کے معاملے میں بالکل مطلق العنان ہوتا ہے۔ وہ تقریر کرتے ہوئے یا عہد و پیمان باندھتے ہوتے اس بات کی قطعاً کوئی پروا نہیں کرتا کہ جو الفاظ وہ زبان سے ادا کر رہا ہے اس کی نظر میں ان کی کوئی معنویت بھی ہے۔ وہ مجمع بازوں کی طرح ہر مجمع کی نفسیات دیکھ کر لوگوں کے جذبات سے کھیلتا ہے اگر مزدوروں کا مجمع ہے تو وہ ان کا خیر خواہ بن کر بڑی بے تکلفی کے ساتھ سرمایہ داروں کو گالیاں دیتا ہے اور اگر سرمایہ داروں کے کسی جلسے میں اسے اظہار خیال کا موقع میسر آیا ہو اور وہ مزدوروں کی روش سے نالاں نظر آتے ہیں تو مزدوروں کو بے نقط سنا کر زرداروں کو خوش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر کسی اجتماع پر مذہبیت کا رنگ غالب دیکھتا ہے تو وہاں مذہب اور دین کا پرستار بن کر سامعین کو متاثر کرتا ہے اور جہاں رندانِ بادہ خوار جمع ہوں وہاں اپنی رندی اور ہوسناکی کی داستانیں سنا کر ان پر اپنی برتری ثابت کرتا ہے۔ اگر عوام کے دلوں میں کسی قوم کے خلاف انتقام کی آگ بھڑک رہی ہو تو وہ ایک جنگجو کے انداز میں جنگ و جدال کی باتیں کرتا ہے اور اگر اس پر افسردگی کا عالم طاری ہو تو پھر اس کے سامنے اس کی مجبوریاں اور ہولناکیوں کا تذکرہ کر کے اسے یاس و قنوطیت کے حوالے کر دیتا ہے۔ آمر کا کوئی لگا بندھا اصول یا نظریہ نہیں ہوتا۔ اس کے سامنے صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ وہ حاکم مطلق بن کر اس پر تاحیات فرمانروائی کرتا رہے۔

آمر کا دوسرا موثر حربہ یہ ہے کہ وہ ہر ایسا کام کرتا ہے جس میں اس کی شخصیت کی بے جا نمائش ہو سکے۔ وہ ملک کے ذرائع ابلاغ کو اپنی ذات کے بارے میں مبالغہ آمیز تاثرات قائم کرنے کے لیے بے دریغ استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کی خاطر ملک اور بیرون ملک سے ان بے ضمیر لوگوں کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں جو فنکارانہ مہارت کے ساتھ آمر کی شخصیت کے اندر مصنوعی دلکشی اور دلفریبی پیدا کر سکیں اور اس کے کارناموں کو عوام کے سامنے بڑھا چڑھا کر پیش کرنے میں یدطولیٰ رکھتے ہوں۔ چنانچہ آمر کے سیاسی افق پر ابھرنے کے ساتھ ملک کے اندر یہ تاثر قائم ہونا شروع ہو جاتا ہے کہ قوم کو خوش قسمتی سے ایک ایسے رہنما کی قیادت میسر آ گئی ہے جو باپ سے زیادہ شفیق اور ہمدرد، راہب سے زیادہ بے نفس اور بے لوث، قانونِ قدرت سے زیادہ عادل اور فولاد سے زیادہ مضبوط عزم اور ارادے کا انسان ہے اور جس کی غلامی میں بالکل معجزانہ طور پر قوم کے سارے دکھوں کا مداوا ہو سکے گا۔ یہ تاثر مسلسل پھیلتا چلا جاتا ہے مگر قوم کے مصائب میں قطعاً کوئی کمی واقع نہیں ہوتی بلکہ ان میں خوفناک حد تک اضافہ ہو جاتا ہے

(باقی بر صفحہ ۴۶)

فصل دوم

رسالتِ محمدیؐ پر ایمان لانے کی دعوت

(۵)

حضورؐ پر مجنون ہونے کا الزام | جو بے سروپا الزامات کفارِ قریش حضورؐ پر لگا رہے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ آپ معاذاللہ مجنون ہیں۔ اِسی معنی میں وہ آپ کو مسحور (سحرزدہ یا جادو کا مارا ہوا آدمی) بھی کہتے تھے، اور یہی ان کے اس قول کا مطلب بھی تھا کہ آپ پر جن کا اثر ہے۔ قرآن مجید میں ان کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ:

وَيَقُولُونَ أَئِنَّا لَتَارِكُوا آلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُونٍ۔ (الصّٰفّٰت۔۳۶)	اور وہ کہتے ہیں "کیا ہم اپنے معبودوں کو کو ایک مجنون شاعر کی خاطر چھوڑ بیٹھیں"؟

دوسری جگہ ان کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ:

وَقَالَ الظّٰلِمُونَ إِن تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا مَّسْحُورًا (الفرقان۔۸)	اور یہ ظالم کہتے ہیں کہ "تم تو بس ایک جادو کے مارے ہوئے آدمی کے پیچھے لگ گئے ہو"۔

ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے:

أَمْ يَقُولُونَ بِهِ جِنَّةٌ۔ (المومنون۔۷۰)	کیا یہ کہتے ہیں کہ اِس پر جن کا اثر ہے؟ یعنی جن کے اثر سے یہ مجنون ہو گیا ہے)۔

ان سارے اعتراضات کا مطلب ایک ہی تھا، کیونکہ اہلِ عرب کے نزدیک آدمی کی دیوانگی کے وجوہ دو ہی تھے۔ یا تو کسی نے جادو کر کے اُسے پاگل بنا دیا ہو، یا کوئی جن اس پر مسلط ہو گیا ہو۔

قرآن مجید میں ان کے یہ اعتراضات دراصل یہ بتانے کے لیے نقل کیے گئے تھے کہ معترضین کس قدر عناد اور تعصب میں اندھے ہو چکے ہیں۔ اُن کے جو اعتراضات یہاں اور دوسرے مقامات پر بیان کیے گئے ہیں ان میں سے کوئی بھی اس لائق نہ تھا کہ اُس پر سنجیدگی کے ساتھ بحث کی جاتی۔ ان کا بس ذکر کر دینا ہی یہ بتانے کے

لیے کافی تھا کہ مخالفین کا دامن دلائل سے کس قدر خالی ہے اور وہ کیسی لچر اور پوچ باتوں سے ایک مدلل اصولی دعوت کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ ایک شخص کہتا ہے لوگو! یہ شرک جس پر تمہارے مذہب و تمدن کی بنیاد قائم ہے ایک غلط عقیدہ ہے اور اس کے غلط ہونے کے یہ اور یہ دلائل ہیں۔ جواب میں شرک کے برحق ہونے پر کوئی دلیل قائم نہیں کی جاتی۔ بس آوازہ کس دیا جاتا ہے کہ یہ جادو کا مارا ہوا آدمی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کائنات کا سارا نظام توحید پر چل رہا ہے اور یہ یہ حقائق ہیں جو اس کی شہادت دیتے ہیں۔ جواب میں شور بلند ہوتا ہے جادوگر ہے۔ وہ کہتا ہے تم دنیا میں شتر بے مہار بنا کر نہیں چھوڑ دیے گئے ہو بلکہ تمہیں اپنے رب کے پاس پلٹ کر جانا ہے، دوسری زندگی میں اپنے اعمال کا حساب دینا ہے اور اس حقیقت پر یہ اخلاقی اور یہ تاریخی اور یہ علمی و عقلی امور دلالت کر رہے ہیں۔ جواب میں کہا جاتا ہے شاعر ہے۔ وہ کہتا ہے میں خدا کی طرف سے تمہارے لیے تعلیمِ حق لے کر آیا ہوں اور یہ ہے وہ تعلیم۔ جواب میں اس تعلیم پر کوئی بحث و تنقید نہیں ہوتی۔ بس بلاثبوت ایک الزام چسپاں کر دیا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ کہیں سے نقل کر لیا گیا ہے۔ وہ اپنی رسالت کے ثبوت میں خدا کے معجزانہ کلام کو پیش کرتا ہے، خود اپنی زندگی اور اپنی سیرت و کردار کو پیش کرتا ہے اور اس اخلاقی انقلاب کو پیش کرتا ہے جو اس کے اثر سے اس کے پیرووں کی زندگی میں ہو رہا ہے۔ مگر مخالفت کرنے والے ان میں سے کسی چیز کو بھی نہیں دیکھتے۔ پوچھتے ہیں تو یہ پوچھتے ہیں کہ تم کھاتے کیوں ہو؟ بازاروں میں کیوں چلتے پھرتے ہو؟ تمہاری اردل میں کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا ہے؟ تمہارے پاس کوئی خزانہ یا باغ کیوں نہیں ہے؟ یہ باتیں خود ہی بتا رہی تھیں کہ فریقین میں سے حق پر کون ہے اور کون اس کے مقابلے میں عاجز آ کر بے تکی ہانک رہا ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۗ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ (سبا-۴۶)

اے نبیؐ، ان سے کہو کہ "میں تمہیں بس ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں۔ خدا کے لیے تم اکیلے اکیلے اور دو دو مل کر اپنا دماغ لڑاؤ اور سوچو، تمہارے رفیق میں آخر ایسی کونسی بات ہے جو جنون کی ہو؟ وہ تو ایک سخت عذاب کی آمد سے پہلے تم کو متنبہ کرنے والا ہے۔"

یعنی اغراض اور خواہشات اور تعصبات سے پاک ہو کر خالصتہً للہ غور کرو۔ ہر شخص الگ الگ بھی نیک نیتی کے ساتھ سوچے اور دو دو چار چار آدمی سر جوڑ کر بھی بے لاگ طریقے سے ایک دوسرے کے ساتھ بحث کر کے تحقیق کریں کہ آخر وہ کیا بات ہے جس کی بنا پر آج تم اس شخص کو مجنون ٹھیرا رہے ہو جسے کل تک تم اپنے درمیان نہایت

دانا آدمی سمجھتے تھے؟ آخر نبوت سے تھوڑی ہی مدت پہلے کا تو واقعہ تھا کہ تعمیر کعبہ کے بعد حجرِ اسود نصب کرنے کے مسئلے پر جب قبائل قریش باہم لڑ پڑے تھے تو تم ہی لوگوں نے بالاتفاق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم تسلیم کیا تھا اور انہوں نے ایسے طریقے سے اس جھگڑے کو چکایا تھا جس پر تم سب مطمئن ہوگئے تھے۔ جس شخص کی عقل و دانش کا یہ تجربہ تمہاری ساری قوم کو ہو چکا ہے، اب کیا بات ایسی ہوگئی کہ تم اسے مجنون کہنے لگے؟ ہٹ دھرمی اور ضد کی بات تو دوسری ہے، مگر کیا واقعی تم اپنے دلوں میں بھی وہی کچھ سمجھتے ہو جو اپنی زبانوں سے کہتے ہو؟ وہ تمہیں ایک سخت عذاب کے آنے سے پہلے خبردار کر رہا ہے۔ کیا یہی وہ قصور ہے جس کی بنا پر تم اسے جنون کا مریض ٹھیراتے ہو؟ کیا تمہارے نزدیک عقلمند وہ ہے جو تمہیں تباہی کے راستے پر جاتے دیکھ کر کہے کہ شاباش، بہت اچھے جارہے ہو؟ اور مجنون وہ ہے جو تمہیں بُرا وقت آنے سے پہلے خبردار کر دے اور فساد کی جگہ صلاح کی راہ بتائے؟

اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ بِہٖ جِنَّۃٌ (المومنون۔۷۰) کیا یہ کہتے ہیں کہ اس شخص کو جنون ہے؟

یعنی کیا ان کے انکار کی وجہ یہ ہے کہ واقعی یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مجنون سمجھتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ اس کی اصل وجہ نہیں ہے۔ کیونکہ زبان سے چاہے وہ کچھ ہی کہتے رہیں، دلوں میں تو وہ اُن کی دانائی و زیرکی کے قائل ہیں۔ علاوہ بریں ایک پاگل اور ایک ہوشمند آدمی کا فرق کوئی ایسا چھپا ہوا تو نہیں ہوتا کہ دونوں میں تمیز کرنا مشکل ہو۔ آخر ایک ہٹ دھرم اور بے حیا آدمی کے سوا کون اس کلام کو سن کر یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ کسی دیوانے کا کلام ہے؟ اور اس شخص کی زندگی کو دیکھ کر کون یہ رائے ظاہر کرسکتا ہے کہ یہ کسی مخبوط الحواس آدمی کی زندگی ہے؟ بڑا ہی عجیب ہے وہ جنون (یا مستشرقین مغرب کی بکواس کے مطابق مرگی کا دورہ) جس میں آدمی کی زبان سے قرآن جیسا کلام نکلے اور جس میں آدمی ایک تحریک کی ایسی کامیاب رہنمائی کرے کہ اپنے ہی ملک کی نہیں، دنیا بھر کی قسمت بدل ڈالے۔

مَآ اَنۡتَ بِنِعۡمَۃِ رَبِّکَ بِمَجۡنُوۡنٍ۔ وَاِنَّ لَکَ لَاَجۡرًا غَیۡرَ مَمۡنُوۡنٍ۔ وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ۔ (القلم۔۲ تا ۴)

اے نبی، تم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہو۔ اور یقیناً تمہارے لیے ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ اور بیشک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو۔

اس مقام پر یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ یہاں خطاب بظاہر تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا، لیکن

اصل مقصود کفار کو اُن کی تہمت کا جواب دینا تھا - لہٰذا کسی شخص کو یہ شبہہ نہ ہو کہ یہ آیت حضورؐ کو یہ اطمینان دلانے کے لیے نازل ہوئی تھی کہ آپ مجنون نہیں ہیں - ظاہر ہے کہ حضورؐ کو اپنے متعلق تو ایسا کوئی شبہہ نہ تھا کہ اُسے دُور کرنے کے لیے آپ کو یہ اطمینان دلانے کی ضرورت ہوتی - مدعا کفار سے یہ کہنا تھا کہ تم جس قرآن کی وجہ سے اُس کے پیش کرنے والے کو مجنون کہہ رہے ہو وہی تمہارے اِس الزام کے جھوٹے ہونے کی دلیل ہے - البتہ حضورؐ کو جس بات کی تسلی دی گئی تھی وہ یہ تھی کہ آپ کے لیے بے حساب اور لازوال اجر ہے کیونکہ آپ خلقِ خدا کی ہدایت کے لیے جو کوششیں کر رہے ہیں اُن کے جواب میں آپ کو ایسی ایسی اذیت ناک باتیں سُننی پڑ رہی ہیں اور پھر بھی آپ اپنے اس فرض کو انجام دیے چلے جا رہے ہیں -

پھر یہ بتایا گیا کہ آپ کے بلند اخلاق اِس بات کا صریح ثبوت ہیں کہ کفار آپ پر دیوانگی کی جو تُہمت رکھ رہے ہیں وہ سراسر جھوٹی ہے، کیونکہ اخلاق کی بلندی اور دیوانگی، دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں - دیوانہ وہ شخص ہوتا ہے جس کا ذہنی توازُن بگڑا ہوا ہو اور جس کے مزاج میں اعتدال باقی نہ رہا ہو - اِس کے برعکس آدمی کے بلند اخلاق اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ نہایت صحیح الدّماغ اور سلیم الفطرت انسان ہے اور اُس کا ذہن اور مزاج غایت درجہ متوازن ہے - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے اخلاق جیسے کچھ تھے، اہلِ مکہ اُن سے ناواقف نہ تھے - اس لیے اُن کی طرف محض اشارہ کر دینا ہی اس بات کے لیے کافی تھا کہ مکّہ کا ہر معقول آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ وہ لوگ کس قدر بے شرم ہیں جو ایسے بلند اخلاق آدمی کو مجنون کہہ رہے ہیں - اُن کی یہ بیہودگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے لیے نہیں بلکہ خود اُن کے لیے نقصان دہ تھی کہ مخالفت کے جوش میں پاگل ہو کر وہ آپ کے متعلق ایسی بات کہہ رہے تھے جسے کوئی ذی فہم آدمی قابلِ تصوّر نہ مان سکتا تھا - یہی معاملہ اُن مدعیانِ علم و تحقیق کا بھی ہے جو اِس زمانے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم پر مرگی اور جنون کی تُہمت رکھ رہے ہیں - قرآن پاک دنیا میں ہر جگہ مل سکتا ہے، اور حضورؐ کی سیرت بھی اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ لکھی ہوئی موجود ہے - ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے کہ جو لوگ اس بے مثل کتاب کے پیش کرنے والے اور ایسے بلند اخلاق رکھنے والے انسان کو ذہنی مریض قرار دیتے ہیں وہ عداوت کے اندھے جذبے سے مغلوب ہو کر کیسی لغو بات کہہ رہے ہیں -

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِهِمْ	کیا اِن لوگوں نے کبھی سوچا نہیں ؟ ان کے رفیق پر
مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ	جنون کا اثر نہیں ہے - وہ ایک صاف صاف خبردار

مُّبِيْنٌ ۔ (الاعراف۔ ۱۸۴) کر دینے والا ہے۔

رفیق سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کیونکہ آپ مکہ ہی کے لوگوں میں پیدا ہوئے، انہی کے درمیان بسے، بچپے سے جوان اور جوان سے بوڑھے ہوئے۔ نبوت سے پہلے ساری قوم آپ کو ایک نہایت سلیم الطبع اور صحیح الدماغ آدمی کی حیثیت سے جانتی تھی۔ نبوت کے بعد جب آپ نے خدا کا پیغام پہنچانا شروع کیا تو یکایک آپ کو مجنون کہنے لگی۔ ظاہر ہے کہ یہ حکمِ جنون اُن باتوں پر نہ تھا جو آپ نبی ہونے سے پہلے کرتے تھے۔ بلکہ صرف اُنہی باتوں پر لگایا جارہا تھا جن کی آپ نے نبی ہونے کے بعد تبلیغ شروع کی۔ اسی وجہ سے فرمایا جارہا ہے کہ اِن لوگوں نے کبھی سوچا بھی ہے؟ آخر اِن باتوں میں سے کون سی بات جنون کی ہے؟ کونسی بات بے تکی، بے اصل اور غیر معقول ہے؟ اگر یہ آسمان و زمین کے نظام پر غور کرتے یا خدا کی بنائی ہوئی کسی چیز کو بھی بنظرِ تامّل دیکھتے تو انہیں خود معلوم ہو جاتا کہ شرک کی تردید، توحید کے اثبات، بندگیِ رب کی دعوت اور انسان کی ذمہ داری و جواب دہی کے بارے میں جو کچھ اِن کا بھائی اِنہیں سمجھا رہا ہے اس کی صداقت پر یہ پورا نظامِ کائنات اور خلق اللہ کا ذرّہ ذرّہ شہادت دے رہا ہے۔

شاعری کا الزام کفارِ قریش حضورؐ پر شاعر ہونے کا الزام بھی رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ کیا ہم ایک شاعر مجنون کے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں۔ اس کے جواب میں فرمایا گیا:

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ۔ (الشعراء آیت ۲۲۴) اور شعراء کے پیچھے تو بہکے ہوئے لوگ چلا کرتے ہیں۔

یعنی شاعروں کے ساتھ لگے رہنے والے لوگ اپنے اخلاق، عادات و خصائل اور اُفتادِ مزاج میں اُن لوگوں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمہیں نظر آتے ہیں۔ دونوں گروہوں کا فرق ایسا کُھلا ہوا فرق ہے کہ ایک نظر دیکھ کر ہی آدمی جان سکتا ہے کہ یہ کیسے لوگ ہیں اور وہ کیسے۔ ایک طرف انتہائی سنجیدگی، تہذیب، شرافت، راستبازی اور خدا ترسی ہے۔ بات بات میں ذمہ داری کا احساس ہے۔ برتاؤ میں لوگوں کے حقوق کا پاس و لحاظ ہے۔ معاملات میں کمال درجہ کی دیانت و امانت ہے۔ اور زبان جب کھلتی ہے خیر ہی کے لیے کھلتی ہے، شر کا کلمہ اُس سے کبھی ادا نہیں ہوتا۔ سب سے زیادہ یہ کہ اِن لوگوں کو دیکھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ اِن کے سامنے ایک بلند اور پاکیزہ نصب العین ہے جس کی دُھن میں یہ رات دن لگے رہتے ہیں اور اِن کی ساری زندگی ایک مقصدِ عظیم کے لیے وقف ہے۔ دوسری طرف حال یہ ہے کہ کہیں عشق بازی اور شراب نوشی کے مضامین بیان ہو رہے ہیں اور

حاضرین اُچھل اُچھل کر ان پر داد دے رہے ہیں۔ کہیں کسی زنِ بازاری یا کسی گھر کی بہو بیٹی کا حُسن موضوعِ سخن ہے اور سُننے والے اس پر مزے لے رہے ہیں۔ کہیں جنسی مواصلت کی حکایت بیان ہو رہی ہے اور پورے مجمع پر شہوانیت کا بھوت مسلط ہے۔ کہیں ہزل بکا جا رہا ہے یا مسخرہ پن کی باتیں ہو رہی ہیں اور مجمع میں ہر طرف ٹھٹھے لگ رہے ہیں۔ کہیں کسی کی ہجو اُڑائی جا رہی ہے اور لوگ اس سے لُطف لے رہے ہیں۔ کہیں کسی کی بے جا تعریف ہو رہی ہے اور اُس پر تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسائے جا رہے ہیں۔ اور کہیں کسی کے خلاف نفرت، عداوت اور انتقام کے جذبات بھڑکائے جا رہے ہیں اور سننے والوں کے دلوں میں ان سے آگ سی لگی جاتی ہے۔ ان مجلسوں میں شاعروں کے کلام سننے کے لیے جو ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگتے ہیں اور بڑے بڑے شاعروں کے پیچھے جو لوگ لگے پھرتے ہیں ان کو دیکھ کر کوئی شخص یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ اخلاق کی بندشوں سے آزاد، جذبات و خواہشات کی رَو میں بہنے والے، اور لُطف و لذت کے پرستار، نیم حیوان قسم کے لوگ ہیں جن کے ذہن کو کبھی یہ خیال چھو بھی نہیں گیا ہے کہ دنیا میں انسان کے لیے زندگی کا کوئی بلند مقصد اور نصب العین بھی ہو سکتا ہے۔ ان دونوں گروہوں کا کھلا کھلا فرق و امتیاز اگر کسی کو نظر نہیں آتا تو وہ اندھا ہے، اور اگر سب کچھ دیکھ کر بھی کوئی محض حق کو نیچا دکھانے کے لیے ایمان لگل کر یہ کہتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے گرد جمع ہونے والے لوگ اُسی قبیل کے ہیں جیسے شعراء اور ان کے پیچھے لگے رہنے والے لوگ ہوتے ہیں، تو وہ جھوٹ بولنے میں بے حیائی کی ساری حدیں پار کر گیا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِىْ كُلِّ وَادٍ	کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ (یعنی شعراء) ہر وادی میں
يَّهِيْمُوْنَ - (الشعراء آیت ۲۲۵)	بھٹکتے ہیں؟

یعنی کوئی ایک متعین راہ نہیں ہے جس پر وہ سوچتے اور اپنی قوت گویائی صرف کرتے ہوں۔ بلکہ ان کا توسنِ فکر ایک بے لگام گھوڑے کی طرح ہر وادی میں بھٹکتا پھرتا ہے اور جذبات و خواہشات اور اغراض و مقاصد کی ہر نئی رَو اُن کی زبان سے ایک نیا مضمون ادا کراتی ہے جسے سوچنے اور بیان کرنے میں اس بات کا کوئی لحاظ سرے سے ہوتا ہی نہیں کہ یہ بات حق اور صدق بھی ہے؟ کبھی ایک لہر اُٹھی تو حکمت و موعظت کی باتیں ہونے لگیں اور کبھی دوسری لہر آئی تو اُسی زبان سے انتہائی گندے سِفلی جذبات کا ترشح شروع ہو گیا۔ کبھی کسی سے خوش ہوئے تو اُسے آسمان پر چڑھا دیا اور کبھی بگڑ بیٹھے تو اسی کو تحت الثرٰی میں جا گرایا۔ ایک بخیل کو حاتم اور ایک بزدل کو رستم و اسفندیار پر فضیلت دینے میں انہیں ذرا تامل نہیں ہوتا اگر اس سے کوئی غرض وابستہ ہو۔ اس کے برعکس کسی سے رنج پہنچ جائے تو اُس کی پاک زندگی پر دھبہ لگانے اور اُس کی عزت پر خاک پھینکنے میں، بلکہ اس کے نسب

پر طعن کرنے میں بھی ان کو شرم محسوس نہیں ہوتی۔ خدا پرستی اور دہریت، مادہ پرستی اور روحانیت، حسنِ اخلاق اور بد اخلاقی، پاکیزگی اور گندگی، سنجیدگی اور ہزل، قصیدہ اور ہجو سب کچھ ایک ہی شاعر کے کلام میں آپ کو پہلو بہ پہلو مل جائے گا۔ شعراء کی اِن معروف خصوصیات سے جو شخص بھی واقف تھا اس کے دماغ میں یہ بے تکی بات کیسے اتر سکتی تھی کہ اِس قرآن کے لانے والے پر شاعری کی تہمت رکھی جائے جس کی تقریر جچی تلی، جس کی بات دو ٹوک، جس کی راہ بالکل واضح اور متعین ہے، اور جس نے حق اور راستی اور بھلائی کی دعوت سے ہٹ کر کبھی ایک کلمہ بھی زبان سے نہیں نکالا ہے۔

قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ آپ کے مزاج کو تو شاعری کے ساتھ سرے سے کوئی مناسبت ہی نہیں ہے۔ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ (یٰس، آیت ۶۹) "ہم نے اُس کو شعر نہیں سکھایا ہے نہ یہ اس کے کرنے کا کام ہے"۔ یہ ایک ایسی حقیقت تھی کہ جو لوگ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے وہ سب اِسے جانتے تھے۔ معتبر روایات میں آیا ہے کہ کوئی شعر پورا حضورؐ کو یاد نہ تھا۔ دورانِ گفتگو میں کبھی کسی شاعر کا کوئی اچھا شعر زبانِ مبارک پر آتا بھی تو غیر موزوں پڑھ جاتے تھے یا اس میں الفاظ کا اُلٹ پھیر ہو جاتا تھا۔ حضرت حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ دوران تقریر میں آپ نے شاعر کا مصرع یوں نقل کیا۔

كفى بالاسلام والشيب للمرء ناهيا

حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ اصل مصرع یوں ہے:

كفى الشيب والاسلام للمرء ناهيا

ایک مرتبہ عباس بن مرداس سلمی سے آپ نے پوچھا کیا تم ہی نے یہ شعر کہا ہے:

اتجعل نهبي ونهب العبيد وبين الاقرع وعيينه

انہوں نے عرض کیا آخری فقرہ یوں نہیں ہے بلکہ یوں ہے، بَيْنَ عُيَيْنَةَ وَالاقرع۔ آپ نے فرمایا معنی میں تو دونوں یکساں ہیں۔

حضرت عائشہؓ سے پوچھا گیا کہ حضورؐ کبھی اشعار بھی اپنی تقریروں میں استعمال فرماتے تھے؟ انہوں نے فرمایا شعر سے بڑھ کر آپ کو کسی چیز سے نفرت نہ تھی۔ البتہ کبھی کبھار بنی قیس کے شاعر کا ایک شعر پڑھتے تھے مگر اوّل کو آخر اور آخر کو اوّل پڑھ جاتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ عرض کرتے یا رسول اللہ یوں نہیں بلکہ یوں ہے تو

آپ فرماتے "بھائی میں شاعر نہیں ہوں اور نہ شعر گوئی میرے کرنے کا کام ہے"۔ جس قسم کے مضامین سے عرب کی شاعری لبریز تھی وہ یا تو شہوانیت اور عشق بازی کے مضامین تھے، یا شراب نوشی کے، یا قبائلی منافرت اور جنگ وجدل کے، یا نسلی فخر و غرور کے۔ نیکی اور بھلائی کی باتیں اُن میں بہت ہی کم پائی جاتی تھیں۔ پھر جھوٹ، مبالغہ، بہتان، ہجو، بے جا تعریف، ڈینگیں، لعن، پھبتیاں اور مشرکانہ خرافات تو اس شاعری کی رگ رگ میں پیوست تھیں۔ اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے اس شاعری کے متعلق یہ تھی کہ لأن یمتلئ جوف احدکم قیحاً خیر لہ من ان یمتلئ شعراً۔ "تم میں سے کسی شخص کا خول پیپ سے بھر جانا اس سے زیادہ بہتر ہے کہ وہ شعر سے بھرے"۔ تاہم جس شعر میں کوئی اچھی بات ہوتی تھی آپ اس کی داد بھی دیتے تھے اور آپ کا ارشاد تھا کہ اِنَّ من الشعر لحکمۃً "بعض اشعار حکیمانہ ہوتے ہیں"۔ اُمیہ بن ابی الصلت کا کلام سُن کر آپ نے فرمایا اٰمَنَ شِعرُہٗ وَکَفَرَ قَلْبُہٗ "اس کا شعر مومن ہے مگر اس کا دل کافر ہے"۔ ایک مرتبہ ایک صحابی نے سَو کے قریب عمدہ عمدہ اشعار آپ کو سُنائے اور آپ فرماتے گئے ھیہ "اور سناؤ"۔

وَاَنَّھُمْ یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ — اور وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں ہیں۔

(الشعراء- آیت ۲۲۶)

یہ شاعروں کی ایک اور خصوصیت ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل کی عین ضد تھی۔ حضورؐ کے متعلق آپ کا ہر جاننے والا جانتا تھا کہ آپ جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں اور جو کرتے ہیں وہی کہتے ہیں۔ آپ کے قول اور فعل کی مطابقت ایسی صریح حقیقت تھی جس سے آپ کے گرد و پیش کے معاشرے میں کوئی انکار نہ کر سکتا تھا۔ اس کے برعکس شعراء کے متعلق کس کو معلوم نہ تھا کہ ان کے ہاں کہنے کی باتیں اور ہیں اور کرنے کی اور؟ سخاوت کا مضمون اِس زور شور سے بیان کریں گے کہ آدمی سمجھے کہ شاید ان سے بڑھ کر دریا دل کوئی نہ ہوگا، مگر عمل میں کوئی دیکھے تو معلوم ہوگا کہ سخت بخیل ہیں۔ بہادری کی باتیں کریں گے مگر خود بزدل ہوں گے۔ بے نیازی اور قناعت اور خودداری کے مضامین باندھیں گے مگر خود حرص و طمع میں ذلت کی آخری حد کو پار کر جائیں گے۔ دوسروں کی ادنیٰ کمزوریوں پر گرفت کریں گے مگر خود بدترین کمزوریوں میں مبتلا ہوں گے۔

مخالفین کے الزامات کا تضاد اور اس پر قرآن کی گرفت پچھلے صفحات میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کفارِ مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر متضاد الزامات لگاتے تھے اور کوئی ایک الزام تعین کے ساتھ انھوں نے

کبھی نہیں لگایا۔ قرآن مجید میں اُن کی اسی کمزوری پر گرفت کر کے ان کا جھوٹا ہونا ثابت کیا گیا۔

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ ۞ اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ۞ قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ ۞ اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ۞ (الطور۔ ۲۹ تا ۳۲)	پس اے نبیؐ! تم نصیحت کیے جاؤ، اپنے رب کے فضل سے نہ تم کاہن ہو اور نہ مجنون۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ شخص شاعر ہے جس کے حق میں ہم گردشِ ایام کا انتظار کر رہے ہیں؟ ان سے کہو اچھا انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔ کیا ان کی عقلیں انہیں ایسی ہی باتیں کرنے کے لیے کہتی ہیں؟ یا درحقیقت یہ عناد میں حد سے گزر گئے ہیں۔

ان چند فقروں میں مخالفین کے سارے پروپیگنڈے کی ہوا نکال کر انہیں بالکل بے نقاب کر دیا گیا ہے۔ استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ قریش کے سردار اور شیوخ بڑے عقلمند بنے پھرتے ہیں، مگر کیا ان کی عقل یہی کہتی ہے کہ جو شخص شاعر نہیں ہے اسے شاعر کہو، جسے ساری قوم ایک دانا آدمی کی حیثیت سے جانتی ہے اُسے مجنون کہو، اور جس شخص کا کہانت سے کوئی دور دراز کا تعلق بھی نہیں ہے اسے خواہ مخواہ کاہن قرار دو۔ پھر اگر عقل ہی کی بنا پر یہ لوگ حکم لگاتے تو کوئی ایک حکم لگاتے۔ بہت سے متضاد حکم تو ایک ساتھ نہیں لگا سکتے تھے۔ ایک شخص آخر بیک وقت شاعر، مجنون اور کاہن کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ مجنون ہے تو نہ کاہن ہو سکتا ہے نہ شاعر۔ کاہن ہے تو شاعر نہیں ہو سکتا اور شاعر ہے تو کاہن نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ شعر کی زبان اور اس کے موضوعات بحث الگ ہوتے ہیں اور کہانت کی زبان اور اس کے مضامین الگ۔ ایک ہی کلام کو بیک وقت شعر بھی کہنا اور کہانت بھی قرار دینا کسی ایسے آدمی کا کام نہیں ہو سکتا جو شعر اور کہانت کا فرق جانتا ہو۔ پس یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں یہ متضاد باتیں عقل سے نہیں، بلکہ سراسر ضد اور ہٹ دھرمی سے کی جا رہی ہیں، اور قوم کے یہ بڑے بڑے سردار عناد کے جوش میں اندھے ہو کر محض بے سروپا الزامات لگا رہے ہیں جنہیں کوئی سنجیدہ انسان قابلِ اعتنا نہیں سمجھ سکتا۔

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ۞ (بنی اسرائیل۔ ۴۸)	اے نبیؐ، دیکھو کیسی باتیں ہیں جو یہ لوگ تم پر چھانٹتے ہیں۔ یہ بھٹک گئے ہیں۔ انہیں راستہ نہیں ملتا۔

یعنی یہ تمہارے متعلق کوئی ایک رائے ظاہر نہیں کرتے بلکہ مختلف اوقات میں بالکل مختلف اور متضاد باتیں کہتے

ہیں۔ کبھی کہتے ہیں تم خود جادوگر ہو، کبھی کہتے ہیں تم پر کسی اور نے جادو کر دیا ہے، کبھی کہتے ہیں تم شاعر ہو، کبھی کہتے ہیں تم مجنون ہو اور کبھی یہ کہ کاہن ہو۔ ان کی یہ متضاد باتیں خود اس بات کا ثبوت ہیں کہ حقیقت ان کو معلوم نہیں ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ وہ آئے دن ایک نئی بات چھانٹنے کے بجائے کوئی ایک ہی قطعی رائے ظاہر کرتے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے کسی قول پر بھی مطمئن نہیں ہیں۔ ایک الزام رکھتے ہیں، پھر آپ ہی محسوس کرتے ہیں کہ یہ چسپاں نہیں ہوتا، اس کے بعد دوسرا الزام لگاتے ہیں اور اسے بھی لگتا ہوا نہ پا کر ایک تیسرا الزام تصنیف کر دیتے ہیں۔ اس طرح ان کا ہر نیا الزام ان کے پہلے الزام کی تردید کر دیتا ہے اور اس سے پتہ چل جاتا ہے کہ صداقت سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ہے، محض عداوت کی بنا پر ایک سے ایک بڑھ کر جھوٹ گھڑے جا رہے ہیں۔

بَلْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ ۔ (قٓ-۵)

بلکہ ان لوگوں نے تو جس وقت حق ان کے پاس آیا اُسی وقت اسے صاف جھٹلا دیا۔ اسی وجہ سے اب یہ اُلجھن میں پڑے ہوئے ہیں۔

اس مختصر سے فقرے میں بھی ایک بہت بڑا مضمون بیان کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے صرف تعجب کرنے اور بعید از عقل ٹھیرانے پر ہی اکتفا نہ کیا، بلکہ جس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی دعوتِ حق پیش کی اُسی وقت بلا تامل اُسے قطعی جھوٹ قرار دے دیا۔ اس کا نتیجہ لازماً یہ ہونا تھا اور یہی ہوا کہ انہیں اِس دعوت اور اِس کے پیش کرنے والے رسول کے معاملہ میں کسی ایک موقف پر قرار نہیں ہے۔ کبھی اُس کو شاعر کہتے ہیں تو کبھی کاہن اور کبھی مجنون۔ کبھی کہتے ہیں کہ یہ جادُوگر ہے اور کبھی کہتے ہیں کہ کسی نے اس پر جادُو کر دیا ہے۔ کبھی کہتے ہیں کہ یہ اپنی بڑائی قائم کرنے کے لیے خود یہ چیز بنالایا ہے، اور کبھی یہ الزام تراشتے ہیں کہ اس کے پسِ پُشت کچھ دوسرے لوگ ہیں جو یہ کلام گھڑ گھڑ کر اسے دیتے ہیں۔ یہ متضاد باتیں خود ظاہر کرتی ہیں کہ یہ لوگ اپنے موقف میں بالکل اُلجھ کر رہ گئے ہیں۔ اِس اُلجھن میں یہ ہرگز نہ پڑتے اگر جلد بازی کر کے نبیؐ کو پہلے ہی قدم پر جھٹلا نہ دیتے اور بلا فکر و تامل ایک پیشگی فیصلہ صادر کر دینے سے پہلے سنجیدگی کے ساتھ غور کرتے کہ یہ دعوت کون پیش کر رہا ہے، کیا بات کہہ رہا ہے اور اس کے لیے دلیل کیا دے رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ شخص ان کے لیے اجنبی نہ تھا۔ کہیں سے اچانک ان کے درمیان نہ آ کھڑا ہوا تھا۔ اِن کی اپنی ہی قوم کا فرد تھا۔ اِن کا اپنا دیکھا بھالا آدمی تھا۔ یہ اُس کی سیرت و کردار اور اُس کی قابلیت سے ناواقف نہ تھے۔ ایسے آدمی کی طرف سے جب ایک بات پیش کی گئی تھی تو چاہے اسے فوراً قبول نہ کر لیا جاتا، مگر وہ اِس کی مستحق بھی تو نہ تھی کہ سنتے ہی اسے رَدّ کر دیا جاتا۔ پھر وہ بات بے دلیل بھی نہ تھی۔ وہ

اس کے لیے دلائل پیش کر رہا تھا - چاہیے تھا کہ اُس کے دلائل کھلے کانوں سے سُنے جاتے اور تعصب کے بغیر اُن کو جانچ کر دیکھا جاتا کہ وہ کہاں تک معقول ہیں - لیکن یہ روش اختیار کرنے کے بجائے جب ان لوگوں نے ضد میں آکر ابتداء ہی میں اُسے جھٹلا دیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک حقیقت تک پہنچنے کا دروازہ تو انہوں نے اپنے لیے خود بند کر لیا اور ہر طرف بھٹکتے پھرنے کے بہت سے راستے کھول لیے - اب یہ اپنی ابتدائی غلطی کو نباہنے کے لیے دس متضاد باتیں تو بنا سکتے ہیں، مگر اس ایک بات کو سوچنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں کہ نبی سچا بھی ہو سکتا ہے اور اُس کی پیش کردہ بات حقیقت بھی ہو سکتی ہے۔

وَإِذَا رَأَوْكَ إِنْ يَتَّخِذُونَكَ إِلَّا	اے نبیؐ، یہ لوگ جب تمہیں دیکھتے ہیں تو بس تمہارا
هُزُوًا - أَهَٰذَا الَّذِي بَعَثَ اللَّهُ	مذاق اُڑانے لگتے ہیں - (کہتے ہیں) کیا یہ شخص ہے جسے
رَسُولًا - إِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ	خدا نے رسول بنا کر بھیجا ہے ؟ اس نے تو ہمیں گمراہ کر
آلِهَتِنَا لَوْلَا أَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا -	کے اپنے معبودوں سے برگشتہ ہی کر دیا ہوتا اگر ہم اُن کی
(الفرقان - ۴۱-۴۲)	عقیدت پر جم نہ گئے ہوتے ۔"

کفار کی یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے متضاد ہیں - پہلی بات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپ کو حقیر سمجھ رہے ہیں اور مذاق اُڑا کر آپ کی قدر گرانا چاہتے ہیں، گویا اُن کے نزدیک آنحضرتؐ نے اپنی حیثیت سے بہت اُونچا دعویٰ کر دیا تھا - دوسری بات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپ کے دلائل کی قوت اور آپ کی شخصیت کا لوہا مان رہے ہیں اور بے ساختہ اعتراف کرتے ہیں کہ اگر ہم تعصب اور ہٹ دھرمی سے کام لے کر اپنے خداؤں کی بندگی پر جم نہ گئے ہوتے تو یہ شخص ہمارے قدم اُکھاڑ چکا ہوتا - یہ متضاد باتیں خود بتا رہی ہیں کہ اسلامی تحریک نے ان لوگوں کو کس قدر بوکھلا دیا تھا - کھسیانے ہو کر مذاق بھی اُڑاتے تھے تو احساس کمتری بلا ارادہ ان کی زبان سے وہ باتیں نکلوا دیتا تھا جن سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ دلوں میں وہ اِس طاقت سے کس قدر مرعوب ہیں۔

طرح طرح کے معجزات کا مطالبہ الزامات کی بوچھاڑ کرنے کے ساتھ ساتھ کفارِ قریش بار بار آپؐ سے طرح طرح کے معجزات کا مطالبہ کرتے تھے - چنانچہ قرآن میں جگہ جگہ ان مطالبات کا ذکر آیا ہے اور ان کا جواب دیا گیا ہے۔

وَقَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَفْجُرَ لَنَا	اور انہوں نے کہا" ہم تیری بات نہ مانیں گے
مِنَ الْأَرْضِ يَنْبُوعًا - أَوْ تَكُونَ	جب تک کہ تو ہمارے لیے زمین کو پھاڑ کر ایک چشمہ

لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ
فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۙ
اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ
عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ
قَبِيْلًا ۙ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ
زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ وَ
لَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ
عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ سُبْحَانَ
رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۙ
(بنی اسرائیل ۹۰ تا ۹۳)

جاری نہ کر دے۔ یا تیرے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ پیدا ہو اور تُو اس میں نہریں رواں کر دے۔ یا تُو آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمارے اُوپر گرا دے جیسا کہ تیرا دعوٰی ہے۔ یا خدا اور فرشتوں کو رُو در رُو ہمارے سامنے لے آئے۔ یا تیرے لیے سونے کا ایک گھر بن جائے۔ یا تو آسمان پر چڑھ جائے، اور تیرے چڑھنے کا بھی ہم یقین نہ کریں گے جب تک تو ہمارے اُوپر ایک ایسی تحریر نہ اُتار لائے جسے ہم پڑھیں"۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان سے کہو، "پاک ہے میرا پروردگار! کیا میں ایک پیغام لانے والے انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں"؟

معجزات کے مطالبے کا ایک جواب اسی سورہ کی آیت ۵۹ وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ میں گزر چکا ہے[۱]۔ اب یہاں اسی مطالبے کا دوسرا جواب دیا گیا ہے۔ اس مختصر سے جواب کی بلاغت تعریف سے بالاتر ہے۔ مخالفین کا مطالبہ یہ تھا کہ اگر تم پیغمبر ہو تو ابھی زمین کی طرف اشارہ کرو اور یکایک ایک چشمہ پھوٹ بہے۔ یا فوراً ایک لہلہاتا باغ پیدا ہو جائے اور اس میں نہریں جاری ہو جائیں۔ آسمان کی طرف اشارہ کرو اور تمہارے جھٹلانے والوں پر آسمان ٹکڑے ہو کر گر جائے۔ ایک پھونک مارو اور چشم زدن میں سونے کا ایک محل بن کر تیار ہو جائے۔ ایک آواز دو اور ہمارے سامنے خدا اور اس کے فرشتے فوراً آ کھڑے ہوں اور وہ شہادت دیں کہ ہم ہی نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ یا ہماری آنکھوں کے سامنے آسمان پر چڑھ کر جاؤ اور اللہ میاں سے ایک خط ہمارے نام لکھوا لاؤ جسے ہم ہاتھ سے چھوئیں اور آنکھوں سے پڑھیں ـــــ ان لمبے چوڑے مطالبوں کا بس یہ جواب دے کر چھوڑ دیا گیا کہ "ان سے کہو، پاک ہے میرا پروردگار! کیا میں ایک پیغام لانے والے انسان

---

[۱] وہ جواب یہ تھا کہ جو معجزات کسی نبی کی دلیل نبوت کے طور پر پیش کیے گئے ہوں اُن کو دیکھ کر بھی جب کوئی قوم نبی کو جھٹلا دیتی ہے تو اس پر لازماً خدا کا عذاب نازل ہو جاتا ہے اور اس کی بکثرت مثالیں تاریخ میں گزر چکی ہیں۔ اب یہ سراسر اللہ کی رحمت ہے کہ وہ ایسا کوئی معجزہ نہیں بھیج رہا ہے۔ مگر تم لوگ ایسے نادان ہو کہ اس کا مطالبہ کر رہے ہو۔

کے سوا اور بھی کچھ ہوں"؟ یعنی بیوقوفو! کیا میں نے خدا ہونے کا دعویٰ کیا تھا کہ تم یہ مطالبے مجھ سے کرنے لگے؟ میں نے تم سے کب کہا تھا کہ میں قادرِ مطلق ہوں؟ میں نے کب کہا تھا کہ زمین و آسمان پر میری حکومت چل رہی ہے؟ میرا دعویٰ تو اوّل روز سے یہی تھا کہ میں خدا کی طرف سے پیغام لانے والا ایک انسان ہوں۔ تمھیں جانچنا ہے تو میرے پیغام کو جانچو۔ ایمان لانا ہے تو اس پیغام کی صداقت و معقولیت دیکھ کر ایمان لاؤ۔ انکار کرنا ہے تو اس پیغام میں کوئی نقص نکال کر دکھاؤ۔ میری صداقت کا اطمینان کرنا ہے تو ایک انسان ہونے کی حیثیت سے میری زندگی کو، میرے اخلاق کو، میرے کام کو دیکھو۔ یہ سب چھوڑ کر تم مجھ سے یہ کیا مطالبہ کرنے لگے کہ زمین پھاڑو اور آسمان گراؤ؟ آخر پیغمبری کا اِن کاموں سے کیا تعلق ہے؟

وَقَالُوا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ (العنکبوت ۲۹: ۵۰-۵۱)

یہ لوگ کہتے ہیں کہ "کیوں نہ اُتاری گئیں اس شخص پر نشانیاں (یعنی معجزات) اس کے رب کی طرف سے؟" اے نبیؐ، کہو "نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں اور میں بس ایک صاف صاف خبردار کر دینے والا ہوں"۔ اور کیا ان لوگوں کے لیے یہ (نشانی) کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو انھیں پڑھ کر سنائی جاتی ہے؟ درحقیقت اس میں رحمت ہے اور نصیحت ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔

یعنی اُمّی ہونے کے باوجود تم پر قرآن جیسی کتاب کا نازل ہونا کیا یہ بجائے خود اتنا بڑا معجزہ نہیں ہے کہ تمھاری رسالت پر ایمان لانے کے لیے یہ کافی ہو؟ کیا اس کے بعد بھی کسی اور معجزے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ دوسرے معجزے تو جنھوں نے دیکھے اُن کے لیے وہ معجزے تھے۔ مگر یہ معجزہ تو ہر وقت تمھارے سامنے ہے۔ تمھیں آئے دن پڑھ کر سنایا جاتا ہے۔ تم ہر وقت اسے دیکھ سکتے ہو۔

بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ۝ كَلَّا ۭ بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۝ كَلَّآ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَنْ شَآءَ

بلکہ ان میں سے تو ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ اُس کے نام کھلے خط بھیجے جائیں۔ ہرگز نہیں، اصل بات یہ ہے کہ یہ آخرت کا خوف نہیں رکھتے۔ ہرگز نہیں، یہ تو ایک نصیحت ہے، اب جس کا جی چاہے اس سے سبق

ذَكَرَهٗ (المدثر۔ ۵۲ تا ۵۵) حاصل کر لے۔

یعنی یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اگر واقعی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی مقرر فرمایا ہے تو وہ مکّہ کے ایک ایک سردار اور ایک ایک شیخ کے نام ایک خط لکھ کر بھیجے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے نبی ہیں، تم ان کی پیروی قبول کرو۔ اور یہ خط ایسے ہوں جنہیں دیکھ کر انہیں یقین آجائے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے یہ لکھ کر بھیجے ہیں۔ ایک اور مقام پر قرآن مجید میں کفارِ مکہ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ "ہم نہ مانیں گے جب تک وہ چیز خود ہم کو نہ دی جائے جو اللہ کے رسولوں کو دی گئی ہے[1]" (الانعام، ۱۲۴)۔ ایک دوسری جگہ ان کا یہ مطالبہ نقل کیا گیا ہے کہ آپ ہمارے سامنے آسمان پر چڑھیں اور وہاں سے ایک لکھی لکھائی کتاب لاکر ہمیں دیں جسے ہم پڑھیں۔" (بنی اسرائیل۔ ۹۳)۔ جواب میں فرمایا گیا کہ ان کا یہ مطالبہ ہرگز پورا نہیں کیا جائے گا۔ ان کے ایمان لانے کی اصل وجہ یہ ہے ہی نہیں کہ اُن کے ایسے مطالبے پورے نہیں کیے جاتے، بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ یہ آخرت سے بے خوف ہیں۔ انہوں نے سب کچھ اسی دنیا کو سمجھ رکھا ہے اور انہیں یہ خیال نہیں ہے کہ اس دنیا کی زندگی کے بعد کوئی اور زندگی بھی ہے جس میں ان کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ اسی چیز نے ان کو دنیا میں بے فکر اور غیر ذمہ دار بنا دیا ہے۔ یہ حق اور باطل کے سوال کو سرے سے بے معنی سمجھتے ہیں، کیونکہ انہیں دنیا میں کوئی حق ایسا نظر نہیں آتا جس کی پیروی کا نتیجہ دنیا میں لازماً اچھا ہی نکلتا ہو، اور نہ کوئی باطل ایسا نظر آتا ہے جس کا نتیجہ دنیا میں ضرور بُرا ہی نکلا کرتا ہو۔ اس لیے یہ اس مسئلے پر غور کرنا لاحاصل سمجھتے ہیں کہ فی الواقع حق کیا ہے اور باطل کیا؟ یہ مسئلہ سنجیدگی کے ساتھ اگر قابلِ غور ہو سکتا ہے تو صرف اُس شخص کے لیے جو دنیا کی موجودہ زندگی کو ایک عارضی زندگی سمجھتا ہو اور یہ تسلیم کرتا ہو کہ اصلی اور ابدی زندگی آخرت کی زندگی ہے جہاں حق کا انجام لازماً اچھا ہوگا اور باطل کا انجام لازماً بُرا ہوگا۔ ایسا شخص تو اُن معقول دلائل اور اُن پاکیزہ تعلیمات کو دیکھ کر ایمان لائے گا جو قرآن میں پیش کی گئی ہیں، اور اپنی عقل سے کام لے کر یہ سمجھنے کی کوشش کرے گا کہ قرآن جن عقائد اور اعمال کو غلط کہہ رہا ہے ان میں فی الواقع کیا غلطی ہے۔ لیکن آخرت کا منکر جو سرے سے تلاشِ حق میں سنجیدہ ہی نہیں ہے وہ ایمان نہ لانے کے لیے آئے دن نت نئے مطالبے پیش کرے گا، حالانکہ اس کا خواہ کوئی مطالبہ

[1] سورۂ انعام میں اس کا مختصر جواب یہ دیا گیا ہے کہ اَللّٰهُ يَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ۔ "اللہ خود زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی پیغمبری کا کام کس سے لے اور کس طرح لے"۔

بھی پورا کر دیا جائے وہ انکار کرنے کے لیے کوئی دوسرا بہانہ ڈھونڈ نکالے گا۔ یہی بات ہے جو سورۂ انعام میں فرمائی گئی ہے کہ "اے نبیؐ! اگر ہم تمہارے اوپر کاغذ میں لکھی لکھائی کوئی کتاب بھی اُتار دیتے اور لوگ اُسے اپنے ہاتھوں سے چھو کر بھی دیکھ لیتے تو جنہوں نے حق کا انکار کیا ہے وہ یہی کہتے کہ یہ تو صریح جادو ہے" (انعام-۷)

وَقَالُوا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ؕ	وہ کہتے ہیں کہ اس نبی پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اُتارا
وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ	گیا؟ اگر کہیں ہم نے فرشتہ اُتار دیا ہوتا تو اب تک کبھی کا
لَا يُنْظَرُوْنَ ۝ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا	فیصلہ ہو چکا ہوتا، پھر انہیں کوئی مہلت نہ دی جاتی۔
لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ	اور اگر ہم فرشتے کو اُتارتے تب بھی اسے انسانی شکل
مَّا يَلْبِسُوْنَ ۝	میں اُتارتے اور اس طرح انہیں اسی شبہ میں ڈال دیتے
(الانعام - ۸-۹)	جس میں اب یہ مبتلا ہیں۔

ان لوگوں کا کہنا یہ تھا کہ جب یہ شخص خدا کی طرف سے پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہے تو آسمان سے ایک فرشتہ اُترنا چاہیے تھا جو لوگوں سے کہتا کہ یہ خدا کا پیغمبر ہے، اس کی بات مانو ورنہ تمہیں سزا دی جائے گی۔ جاہل معترضین کو اس بات پر تعجب تھا کہ خالقِ ارض وسماء کسی کو پیغمبر مقرر کرے اور پھر اس طرح اُسے بے یار و مددگار پتھر کھانے اور گالیاں سُننے کے لیے چھوڑ دے۔ اتنے بڑے بادشاہ کا سفیر اگر کسی بڑے اسٹاف کے ساتھ نہ آیا تھا تو کم از کم ایک فرشتہ تو اس کی اردلی میں دینا چاہیے تھا تاکہ وہ اس کی حفاظت کرتا، اس کا رعب بٹھاتا، اس کی ماموریت کا یقین دلاتا اور فوق الفطری طریقے سے اس کے کام انجام دیتا۔

اس کا پہلا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اگر فرشتہ اپنی اصلی صورت میں بھیج دیا جاتا تو فیصلہ چکا دینے کا وقت آجاتا اور پھر مہلت نہ دی جاتی۔ ایمان لانے اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لینے کے لیے جو مہلت تمہیں ملی ہوئی ہے یہ اسی وقت تک ہے جب تک حقیقت پردۂ غیب میں پوشیدہ ہے۔ ورنہ جہاں غیب کا پردہ چاک ہوا، پھر مہلت کا کوئی موقع باقی نہ رہے گا۔ اس کے بعد تو صرف حساب ہی لینا باقی رہ جائے گا۔ اس لیے کہ دنیا کی زندگی تمہارے لیے ایک امتحان کا زمانہ ہے اور امتحان اس امر کا ہے کہ تم حقیقت کو دیکھے بغیر عقل و فکر کے صحیح استعمال سے اس کا ادراک کرتے ہو یا نہیں اور ادراک کرنے کے بعد اپنے نفس اور اس کی خواہشات کو قابو میں لا کر اپنے عمل کو حقیقت کے مطابق درست رکھتے ہو یا نہیں۔ اس امتحان کے لیے غیب کا غیب رہنا شرطِ لازم ہے۔ اور تمہاری دنیوی زندگی، جو دراصل مہلتِ امتحان ہے اُسی وقت تک قائم رہ سکتی ہے جب تک غیب، غیب ہے۔

جہاں غیب شہادت میں تبدیل ہوا، یہ مہلت لازماً ختم ہو جائے گی اور امتحان کے بجائے نتیجۂ امتحان نکلنے کا وقت آ پہنچے گا۔ لہذا تمہارے مطالبہ کے جواب میں یہ ممکن نہیں ہے کہ تمہارے سامنے فرشتے کو اس کی اصلی صورت میں نمایاں کر دیا جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ابھی تمہارے امتحان کی مدت ختم نہیں کرنا چاہتا۔

اس کے بعد دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اگر فرشتہ انسانی صورت میں آتا تو تمہیں وہی شبہات لاحق ہوتے جو اب نبی کے بارے میں لاحق ہو رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ فرشتے کے آنے کی ایک صورت یہ ہو سکتی تھی کہ وہ لوگوں کے سامنے علانیہ اپنی اصلی غیبی صورت میں ظاہر ہوتا۔ لیکن اوپر بتا دیا گیا ہے کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ اب دوسری صورت یہ باقی رہ گئی کہ وہ انسانی صورت میں آئے۔ اس کے متعلق فرمایا جا رہا ہے کہ اگر وہ انسانی صورت میں آئے تو اس کے مامور من اللہ ہونے میں بھی تم کو وہی اشتباہ پیش آئے گا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مامور من اللہ ہونے میں پیش آ رہا ہے۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِى الْكِتٰبِ مِنْ شَىْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِى الظُّلُمٰتِ ؕ

(الانعام - ۳۷ - ۳۹)

یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس (نبی) پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی (یعنی محسوس معجزہ) کیوں نہیں اتاری گئی؟ ان سے کہو کہ اللہ نشانی اتارنے کی پوری قدرت رکھتا ہے مگر ان میں سے اکثر لوگ نادانی میں مبتلا ہیں۔ زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں پروں سے اڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو، یہ سب تمہاری ہی طرح کی انواع ہیں۔ ہم نے ان کی تقدیر کے نوشتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جاتے ہیں مگر جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں وہ بہرے گونگے بنے تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔

اِس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ معجزہ نہ دکھانے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اللہ اس کے دکھانے پر قادر نہیں ہے بلکہ اِس کی وجہ کچھ اور ہے جسے تم لوگ اپنی نادانی کی وجہ سے نہیں سمجھ رہے ہو۔ اگر تمہیں محض تماش بینی کا شوق نہیں ہے، بلکہ فی الواقع یہ معلوم کرنے کے لیے نشانی دیکھنا چاہتے ہو کہ یہ نبی جس چیز کی طرف بلا رہا ہے وہ امرِ حق ہے یا نہیں، تو آنکھیں کھول کر دیکھو، تمہارے گردوپیش ہر طرف نشانیاں ہی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ زمین کے جانوروں اور

ہوا کے پرندوں کی کسی ایک نوع کو لے کر اس کی زندگی پر غور کرو۔ کس طرح اُس کی ساخت ٹھیک اُس کے مناسبِ حال بنائی گئی ہے۔ کس طرح اس کی جبلّت میں اُس کی فطری ضرورتوں کے عین مطابق قوتیں ودیعت کی گئی ہیں۔ کس طرح اس کی رزق رسانی کا انتظام ہو رہا ہے۔ کس طرح اس کی ایک تقدیر مقرر ہے جس کے حدود سے نہ وہ آگے بڑھ سکتی ہے نہ پیچھے ہٹ سکتی ہے۔ کس طرح ان میں سے ایک ایک جانور اور ایک ایک چھوٹے سے چھوٹے کیڑے کی اُسی مقام پر جہاں وہ ہے خبرگیری، نگرانی، حفاظت اور رہنمائی کی جا رہی ہے۔ کس طرح اس سے ایک مقرر اسکیم کے مطابق کام لیا جا رہا ہے۔ کس طرح اسے ایک ضابطہ کا پابند بنا کر رکھا گیا ہے۔ اور کس طرح اس کی پیدائش، تناسل اور موت کا سلسلہ پوری باقاعدگی کے ساتھ چل رہا ہے۔ اگر خدا کی بے شمار نشانیوں میں سے صرف اسی ایک نشانی پر غور کرو تو تمھیں معلوم ہو جائے کہ خدا کی توحید اور اس کی صفات کا جو تصور یہ پیغمبر تمھارے سامنے پیش کر رہا ہے اور اس تصور کے مطابق دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے جس رویّہ کی طرف تمھیں دعوت دے رہا ہے وہ عین حق ہے۔ لیکن تم لوگ نہ خود اپنی آنکھیں کھول کر دیکھتے ہو نہ کسی سمجھانے والے کی بات سنتے ہو۔ جہالت کی تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہو اور چاہتے ہو کہ عجائبِ قدرت کے کرشمے دکھا کر تمھارا دل بہلایا جائے۔

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ	اور کیا ہو جاتا اگر کوئی قرآن ایسا اُتار دیا جاتا جس
اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ	کے زور سے پہاڑ چلنے لگتے، یا زمین شق ہو جاتی، یا
بِهِ الْمَوْتٰى ؕ (الرعد-۳۱)	مُردے قبروں سے نکل کر بولنے لگتے؟

اس آیت کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اس میں خطاب کفار سے نہیں بلکہ مسلمانوں سے ہے۔ مسلمان جب بار بار کفار کی طرف سے نشانی کا مطالبہ سنتے تھے تو اُن کے دلوں میں بے چینی پیدا ہوتی تھی کہ کاش! ان لوگوں کو کوئی ایسی نشانی دکھا دی جاتی جس سے یہ لوگ قائل ہو جاتے۔ پھر جب وہ محسوس کرتے تھے کہ اس طرح کی کسی نشانی کے نہ آنے کی وجہ سے کفار کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے متعلق لوگوں کے دلوں میں شبہات پھیلانے کا موقع مل رہا ہے تو ان کی یہ بے چینی اور بھی زیادہ بڑھ جاتی تھی۔ اس پر مسلمانوں سے فرمایا گیا کہ اگر قرآن کی کسی سورۃ کے ساتھ ایسی اور ایسی نشانیاں یکایک دکھا دی جاتیں تو کیا واقعی تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ لوگ ایمان لے آتے؟ کیا تمھیں ان سے یہ خوش گمانی ہے کہ یہ قبولِ حق کے لیے بالکل تیار بیٹھے ہیں، صرف ایک نشانی کے ظہور کی کسر ہے؟ جن لوگوں کو قرآن کی تعلیم میں، کائنات کے آثار میں، نبیؐ کی پاکیزہ زندگی میں، اصحابِ نبیؐ

کے انقلابِ حیات میں نورِ حق نظر نہ آیا کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ پہاڑوں کے چلنے اور زمین کے پھٹنے اور مُردوں کے قبروں سے نکل آنے میں کوئی روشنی پالیں گے؟

حضورؐ کی رسالت کا صریح ثبوت

اس طرح کفار نے جتنے بھی الزامات و اعتراضات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر کیے اور اُس کا ثبوت مانگنے کے لیے جتنے بھی معجزات دکھانے کے مطالبات کیے، ان میں سے ایک ایک کا نہایت معقول جواب دے کر یہ گنجائش باقی نہیں رہنے دی گئی کہ کوئی شخص عقل و استدلال کی بنیاد پر آپ کی رسالت کو مشتبہ ثابت کر سکتا۔ پھر تین ایسے صریح ثبوت آپ کی رسالت کے حق میں پیش کیے گئے جن سے مکہ اور اس کے اطراف میں رہنے والے کسی شخص کے لیے انکار ممکن نہ تھا۔ ذیل میں ہم ان کو سلسلہ وار درج کرتے ہیں:

وَمَا كُنتَ تَتْلُوا مِن قَبْلِهِ مِن كِتَٰبٍ وَلَا تَخُطُّهُۥ بِيَمِينِكَ ۖ إِذًا لَّٱرْتَابَ ٱلْمُبْطِلُونَ (العنکبوت ۴۸)

(اے نبیؐ) تم اِس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے۔

اس آیت میں استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اَن پڑھ تھے، آپ کے اہل وطن اور رشتہ و برادری کے لوگ، جن کے درمیان روزِ پیدائش سے سنِ کہولت کو پہنچنے تک آپ کی ساری زندگی بسر ہوئی تھی، اس بات سے خوب واقف تھے کہ آپ نے عمر بھر نہ کبھی کوئی کتاب پڑھی، نہ قلم ہاتھ میں لیا۔ اس امرِ واقعہ کو پیش کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ کتبِ آسمانی کی تعلیمات، انبیاءِ سابقین کے حالات، مذاہب و ادیان کے عقائد، قدیم قوموں کی تاریخ، اور تمدن و اخلاق و معیشت کے اہم مسائل پر جس وسیع اور گہرے علم کا اظہار اس اُمّی کی زبان سے ہو رہا ہے یہ اُس کو وحی کے سوا کسی دوسرے ذریعے سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر اس کو نوشت و خواند کا علم ہوتا اور لوگوں نے اسے کبھی کتابیں پڑھتے اور مطالعہ و تحقیق کرتے دیکھا ہوتا تو باطل پرستوں کے لیے یہ شک کرنے کی کچھ بنیاد ہو بھی سکتی تھی کہ یہ علم وحی سے نہیں بلکہ اخذ و اکتساب سے حاصل کیا گیا ہے۔ لیکن اُس کی اُمیت نے تو ایسے کسی شک کے لیے برائے نام بھی کوئی بنیاد باقی نہیں چھوڑی ہے۔ اب خالص ہٹ دھرمی کے سوا اُس کی نبوت کا انکار کرنے کی اور کوئی وجہ نہیں ہے جسے کسی درجے میں بھی معقول کہا جا سکتا ہو۔

قُل لَّوْ شَآءَ ٱللَّهُ مَا تَلَوْتُهُۥ عَلَيْكُمْ وَلَآ أَدْرَىٰكُم بِهِۦ ۖ فَقَدْ

اے نبیؐ، اِن سے کہو کہ "اگر اللہ کی مشیت یہی ہوتی (کہ میں نبی نہ بنایا جاؤں) تو میں یہ قرآن تمہیں کبھی نہ سُناتا اور

لَبِثۡتُ فِيۡكُمۡ عُمُرًا مِّنۡ قَبۡلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ۝ (یونس - ۱۶)

اللہ تمہیں اس کی خبر تک نہ دیتا - آخر اس سے پہلے میں ایک عمر تمہارے درمیان گزار چکا ہوں، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟

یہ ایک زبردست دلیل ہے کفارِ مکہ کے اس خیال کی تردید میں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کو خود اپنے دل سے گھڑ کر خدا کی طرف منسوب کر رہے ہیں، اور حضورؐ کے اس دعوے کی تائید میں کہ آپ خود اس کے مصنف نہیں ہیں بلکہ یہ خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ان پر نازل ہو رہا ہے۔ دوسرے تمام دلائل تو بہت دُور کی چیز تھے، مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تو ان لوگوں کے سامنے کی چیز تھی۔ آپؐ نے نبوت سے پہلے پورے چالیس سال ان کے درمیان گزارے تھے۔ ان کے شہر میں پیدا ہوئے، اُن کی آنکھوں کے سامنے بچپن گزارا، جوان ہوئے، ادھیڑ عمر کو پہنچے۔ رہنا سہنا، ملنا جلنا، لین دین، شادی بیاہ، غرض ہر قسم کا معاشرتی تعلق اُنھی کے ساتھ تھا اور آپ کی زندگی کا کوئی پہلو اُن سے چھپا ہوا نہ تھا۔ ایسی جانی بوجھی اور دیکھی بھالی چیز سے زیادہ کھلی شہادت اور کیا ہو سکتی تھی۔

آپ کی اس زندگی میں دو باتیں بالکل عیاں تھیں جنھیں مکہ کے لوگوں میں سے ایک ایک شخص جانتا تھا:

ایک یہ کہ نبوت سے پہلے کی پوری چالیس سالہ زندگی میں آپ نے کوئی ایسی تعلیم، تربیت اور صحبت نہیں پائی جس سے آپ کو یہ معلومات حاصل ہوتیں جن کے چشمے یکایک دعوائے نبوت کے ساتھ ہی آپ کی زبان سے پھوٹنے شروع ہو گئے۔ اس سے پہلے کبھی آپ اُن مسائل سے دلچسپی لیتے ہوئے، اُن مباحث پر گفتگو کرتے ہوئے، اور اُن خیالات کا اظہار کرتے ہوئے نہیں دیکھے گئے جو اب قرآن کی ان پے در پے سورتوں میں زیر بحث آ رہے تھے۔ حد یہ ہے کہ اس پورے چالیس سال کے دوران میں کبھی آپ کے کسی گہرے دوست اور کسی قریب ترین رشتہ دار نے بھی آپ کی باتوں اور آپ کی حرکات و سکنات میں کوئی ایسی چیز محسوس نہیں کی جسے اُس عظیم الشان دعوت کی تمہید کہا جا سکتا ہو جو آپ نے اچانک چالیسویں سال کو پہنچ کر دینی شروع کر دی۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت تھا کہ قرآن آپ کے اپنے دماغ کی پیداوار نہیں ہے، بلکہ خارج سے آپ کے اندر آئی ہوئی چیز ہے۔ اس لیے کہ انسانی دماغ اپنی عمر کے کسی مرحلے میں بھی ایسی کوئی چیز پیش نہیں کر سکتا جس کے نشوونما اور ارتقا کے واضح نشانات اُس سے پہلے کے مرحلوں میں نہ پائے جاتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ کے بعض چالاک لوگوں نے جب خود محسوس کر لیا کہ قرآن کو آپ کے دماغ کی پیداوار قرار دینا صریح طور پر ایک لغو الزام ہے تو آخر کو انھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ کوئی

اور شخص ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم، کو یہ باتیں سکھا دیتا ہے ۔ لیکن یہ دوسری بات پہلی بات سے بھی زیادہ لغو تھی۔ کیونکہ مکّہ تو درکنار، پورے عرب میں کوئی اس قابلیت کا آدمی نہ تھا جس پر انگلی رکھ کر کہہ دیا جاتا کہ یہ اِس کلام کا مصنّف ہے یا ہو سکتا ہے ۔ ایسی قابلیت کا آدمی کسی سوسائٹی میں چھپا کیسے رہ سکتا ہے۔

دوسری بات جو آپ کی سابق زندگی میں بالکل نمایاں تھی، وہ یہ تھی کہ جھوٹ، فریب، جعل، مکاری، عیاری اور اِس قبیل کے دوسرے اوصاف میں سے کسی کا ادنیٰ شائبہ تک آپ کی سیرت میں نہ پایا جاتا تھا۔ پوری سوسائٹی میں کوئی ایسا نہ تھا جو یہ کہہ سکتا ہو کہ اس چالیس سال کی یکجائی معاشرت میں آپ سے کسی ایسی صفت کا تجربہ اُسے ہوا ہے ۔ برعکس اس کے جن جن لوگوں کو بھی آپ سے سابقہ پیش آیا تھا وہ آپ کو ایک نہایت سچے، بے داغ، اور قابلِ اعتماد (امین) انسان کی حیثیت ہی سے جانتے تھے ۔ اب یہ گمان کرنے کی کیا گنجائش تھی کہ جس شخص نے تمام عمر کبھی اپنی زندگی کے کسی چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی جھوٹ، جعل اور فریب سے کام نہ لیا تھا وہ یکایک اتنا بڑا جھوٹ اور ایسا عظیم الشان جعل و فریب لے کر اُٹھ کھڑا ہوا کہ اپنے ذہن سے کچھ باتیں تصنیف کیں اور ان کو پورے زور اور تحدّی کے ساتھ خدا کی طرف منسوب کرنے لگا۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان کے اس بیہودہ الزام کے جواب میں ان سے کہو کہ اللہ کے بندو، کچھ عقل سے تو کام لو۔ میں کوئی باہر سے آیا ہوا اجنبی آدمی تو نہیں ہوں، تمہارے درمیان ایک عمر اس سے پہلے گزار چکا ہوں۔ میری سابق زندگی کو دیکھتے ہوئے تم کیسے یہ توقع مجھ سے کر سکتے ہو کہ میں خدا کی تعلیم اور اس کے حکم کے بغیر یہ قرآن تمہارے سامنے پیش کر سکتا تھا ؟

وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۔ (القصص-۸۶)	اور اے نبیؐ، تم اس بات کے ہرگز اُمیدوار نہ تھے کہ تم پر کتاب نازل کی جائے گی۔ یہ تو محض تمہارے رب کی مہربانی ہے (کہ یہ تم پر نازل ہوئی ہے)۔

یہ ایک اور دلیل تھی جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت میں پیش کی گئی ۔ جس طرح موسیٰ علیہ السلام بالکل بے خبر تھے کہ انہیں نبی بنایا جانے والا ہے اور ایک عظیم الشان مشن پر وہ مامور کیے جانے والے ہیں، ان کے حاشیۂ خیال میں بھی اِس کا ارادہ یا خواہش تو درکنار اس کی توقع تک کبھی نہ گزری تھی، بس یکایک راہ چلتے انہیں کھینچ بلایا گیا اور نبی بنا کر وہ حیرت انگیز کام اُن سے لیا گیا جو ان کی سابق زندگی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا تھا، ٹھیک ایسا ہی معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی پیش آیا۔ مکہ کے لوگ خود جانتے تھے کہ غارِ حرا سے جس روز آپ نبوت کا پیغام لے کر اترے اس سے ایک دن پہلے تک آپ کی زندگی کیا تھی، آپ کے مشاغل کیا تھے، آپ کی بات چیت کیا تھی، آپ کی گفتگو کے موضوعات کیا تھے، آپ کی دلچسپیاں اور سرگرمیاں کس نوعیت کی تھیں۔ یہ پوری زندگی

صداقت، دیانت، امانت اور پاکبازی سے لبریز ضرور تھی۔ اس میں انتہائی شرافت، امن پسندی، پاسِ عہد، ادائے حقوق اور خدمتِ خلق کا رنگ بھی غیر معمولی شان کے ساتھ نمایاں تھا۔ مگر اس میں کوئی چیز ایسی موجود نہ تھی جس کی بناء پر کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ خیال گزر سکتا ہو کہ یہ نیک بندہ کل نبوت کا دعویٰ لے کر اُٹھنے والا ہے۔ آپ سے قریب ترین ربط ضبط رکھنے والوں میں، آپ کے رشتہ داروں، ہمسایوں اور دوستوں میں کوئی شخص یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ آپ پہلے سے نبی بننے کی تیاری کر رہے تھے۔ کسی نے اُن مضامین اور مسائل اور موضوعات کے متعلق کبھی ایک لفظ تک آپ کی زبان سے نہ سنا تھا جو غارِ حرا کی اُس انقلابی ساعت کے بعد یکایک آپ کی زبان پر جاری ہونے شروع ہو گئے۔ کسی نے آپ کو وہ مخصوص زبان اور وہ الفاظ اور اصطلاحات استعمال کرتے نہ سنا تھا جو اچانک قرآن کی صورت میں لوگ آپ سے سننے لگے۔ کبھی آپ وعظ کہنے کھڑے نہ ہوئے تھے۔ کبھی کوئی دعوت اور تحریک لے کر نہ اُٹھے تھے۔ بلکہ کبھی آپ کی کسی سرگرمی سے یہ گمان تک نہ ہو سکتا تھا کہ آپ اجتماعی مسائل کے حل، یا مذہبی اصلاح، یا اخلاقی اصلاح کے لیے کوئی کام شروع کرنے کی فکر میں ہیں۔ اُس انقلابی ساعت سے ایک دن پہلے تک آپ کی زندگی ایک ایسے تاجر کی زندگی نظر آتی تھی جو سیدھے سادھے جائز طریقوں سے اپنی روزی کماتا ہے، اپنے بال بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی رہتا ہے، مہمانوں کی تواضع، غریبوں کی مدد اور رشتہ داروں سے حسن سلوک کرتا ہے، اور کبھی کبھی عبادت کرنے کے لیے خلوت میں جا بیٹھتا ہے۔ ایسے شخص کا یکایک ایک عالمگیر زلزلہ ڈال دینے والی خطابت کے ساتھ اُٹھنا، ایک انقلاب انگیز دعوت شروع کر دینا، ایک نرالا لٹریچر پیدا کر دینا، ایک مستقل فلسفۂ حیات اور نظامِ فکر و اخلاق و تمدن لے کر سامنے آجانا، اتنا بڑا تغیر تھا جو انسانی نفسیات کے لحاظ سے کسی بناوٹ اور تیاری و ارادی کوشش کے نتیجے میں قطعاً رونما نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے کہ ایسی ہر کوشش اور تیاری بہر حال تدریجی ارتقاء کے مراحل سے گزرتی ہے اور یہ مراحل ان لوگوں سے کبھی مخفی نہیں رہ سکتے جن کے درمیان آدمی شب و روز زندگی گزارتا ہو۔ اگر آنحضرت ﷺ کی زندگی اِن مراحل سے گزری ہوتی تو مکہ میں سینکڑوں زبانیں یہ کہنے والی ہوتیں کہ ہم نہ کہتے تھے کہ یہ شخص ایک دن کوئی بڑا دعویٰ لے کر اُٹھنے والا ہے لیکن تاریخ شاہد ہے کہ کفار مکہ نے آپ پر ہر طرح کے اعتراضات کیے، مگر یہ اعتراض کرنے والا اُن میں سے کوئی ایک شخص بھی نہ تھا۔

پھر یہ بات کہ آپ خود بھی نبوت کے خواہش مند، یا اس کے لیے متوقع اور منتظر نہ تھے، بلکہ پوری بے خبری کی حالت میں اچانک آپ کو اس معاملہ سے سابقہ پیش آگیا، اس کا ثبوت اُس واقعہ سے ملتا ہے جو احادیث میں آغازِ وحی کی کیفیت کے متعلق موجود ہے۔ (چونکہ اس سے پہلے ہم "آغازِ رسالت" کے باب میں اس کی تفصیل درج کر چکے ہیں، اس لیے یہاں اس کے اعادے کی حاجت نہیں ہے)۔

(باقی)

ٹورانٹو (کینیڈا) میں ایک مجلس

ابو الاعلیٰ مودودی

(۲)

سوال نمبر ۱۰۔ ترقی کا صحیح مفہوم

"اگر ہم زمانے کا ساتھ نہ دیں تو ترقی کیسے کر سکتے ہیں۔ اس صورت میں تو ہم دنیا سے پیچھے رہ جائیں گے۔"

جواب:۔ اس سے پہلے ایک حدیث کی تشریح میں جو کچھ میں نے کہا ہے اس میں اس سوال کا جواب پوری طرح آگیا ہے۔ ایک بگڑی ہوئی سوسائٹی کے اندر شراب اور زنا اور جوا تو ایسے حلال وطیب ہو جاتے ہیں کہ علی الاعلان ان کے ارتکاب میں بھی کوئی قباحت محسوس نہیں کی جاتی بلکہ ان پر اعتراض کرنے والا اُلٹا نکّو بن جاتا ہے۔ ان سے بھی آگے بڑھ کر ایسے گھناؤنے افعال بھی جن کا نام لیتے ہوئے شرم آتی ہے، کھلے بندوں کیے جانے لگتے ہیں، یہاں تک کہ پوری بے باکی کے ساتھ ان کو جائز کر دینے کا مطالبہ صرف کیا ہی نہیں جاتا بلکہ مان بھی لیا جاتا ہے۔ ایسے حالات میں ایک مسلمان کا یہ کام نہیں ہے کہ غلط قسم کی ترقی (PROGRESS) میں اپنے آپ کو بھی شامل کرلے۔ ترقی یافتہ قوموں کا ہر فعل ترقی نہیں ہے۔ ترقی دراصل ایک اضافی اصطلاح (RELATIVE TERM) ہے۔ ہر شخص یا گروہ اپنے سامنے جو ہدف (GOAL) رکھتا ہے اس کی طرف پیش قدمی کو وہ ترقی سمجھتا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہی ہدف ہمارا بھی ہو جو اُس کا ہے۔ ہم اگر اس ہدف کو غلط سمجھتے ہیں تو اس کی طرف جتنی پیش قدمی بھی ہم کریں گے وہ ہمارے لیے ترقی نہیں ہوگی بلکہ الٹی رجعت ہوگی اور ہم اپنے ہدف سے دُور تر ہوتے چلے جائیں گے۔ اب آپ خود دیکھ لیں کہ کیا مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا بھی وہی ہدف ہے جس کی طرف دنیا کی یہ بگڑی ہوئی قومیں چلی جا رہی ہیں؟ اگر ہمارا یہ ہدف نہیں ہے تو اس کی طرف پیش قدمی ہمارے لیے ترقی کیسے ہو سکتی ہے۔ ہم ایک خدا اور ایک رسول اور ایک کتاب کے ماننے والے ہیں اور

ہمارا ہدف نیکی اور تقویٰ کی زندگی ہے جو آخرت میں ہم کو فلاح و سعادت سے ہمکنار کرے۔ ہمارے دین نے ہم کو مستقل قدریں (PERMANENT VALUES) دی ہیں جو کبھی بدل نہیں سکتیں۔ جو کچھ حرام ہے وہ ہمیشہ کے لیے حرام ہے، اسے حلال نہیں کیا جا سکتا، اور جو کچھ حلال ہے وہ ہمیشہ کے لیے حلال ہے، اُسے حرام نہیں کیا جا سکتا۔ ہم ان قوموں کی طرح نہیں ہیں جن کی قدریں روز بدلتی ہیں۔ آج جو نیکی ہے کل وہ بدی بن جاتی ہے اور آج جو حرام ہے کل وہ حلال ہو جاتا ہے۔ ایسی ناپائدار قدروں کو ہم کیسے قبول کر سکتے ہیں۔ ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ دنیا جس طرف جا رہی ہو ہم بھی اسی طرف جائیں۔ ہمارا کام یہ ہے کہ اگر دریا غلط راستہ کی طرف بہہ رہا ہو تو ہم اس کا رخ پلٹ دیں، یا اگر اس کا رُخ پلٹ نہ سکیں تو اس کی زد کے خلاف چلیں۔ اس کی رو کے خلاف چل کر اپنے ہاتھ پاؤں توڑ لینا اور اُس کے بھنور میں آکر ڈوب جانا اس سے بہتر ہے کہ ہم اس کے ساتھ بہتے ہوئے اپنی منزل سے دُور ہوتے چلے جائیں۔

سوال نمبر ۱۱۔ پردہ مغربی معاشرے میں

"پردہ کے اصطلاحی پہلو کے بارے میں اسلام کا قاعدہ کیا ہے؟ آپ مغربی دنیا میں اس پر کیسے عمل کرا سکتے ہیں؟ مردوں اور عورتوں کے مخلوط اجتماعات کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب:۔ آپ لوگ اس معاملے میں میرے خیالات جانتے ہوں گے۔ میری کتاب پردہ اُردو، عربی اور انگریزی میں شائع ہو چکی ہے۔ تفسیر سورۂ نور میں بھی اس کی پوری وضاحت کر چکا ہوں اور یہ بھی اُردو اور عربی میں شائع شدہ موجود ہے۔ سورۂ احزاب کی تفسیر اگرچہ دوسری کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی، مگر اُردو میں تو شائع ہو چکی ہے۔ اس کے بعد میں نہیں سمجھ سکا کہ یہاں یہ سوال کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی۔ یہ بات سب لوگوں کو معلوم ہونی چاہیے کہ اسلام عورتوں اور مردوں کے آزادانہ میل جول اور مخلوط سوسائٹی (MIXED SOCIETY) کا قطعی قائل نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم کے زمانے میں جب عورتوں نے یہ چاہا کہ انہیں مسجد نبوی میں آکر حضورؐ کے پیچھے نماز پڑھنے کی اجازت دی جائے تو آپؐ نے انہیں منع تو نہیں کیا مگر فرمایا کہ تمہارا اپنے گھر میں نماز پڑھنا میری مسجد میں آکر پڑھنے سے بہتر ہے، اور تمہارا اپنے گھر کے اندر کسی حجرے میں پڑھنا اپنے گھر کے دالان میں پڑھنے سے بہتر ہے۔ پھر جب عورتوں نے اس شوق کا اظہار کیا کہ وہ آپ کے پیچھے نماز باجماعت میں شریک ہوں تو آپؐ نے صرف صبح اور عشا کے وقت آنے کی اجازت

دی، ان کے آنے جانے کے لیے الگ دروازہ مخصوص کر دیا، اور اُن کے لیے مردوں کی صفوں کے پیچھے کی صفیں مقرر فرمائیں۔ اُس زمانے میں صبح کی نماز ایسے وقت ختم ہوتی تھی جب نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے واپس جاتے وقت بھی اتنا اندھیرا ہوتا تھا کہ ایک دوسرے کو پہچانا نہیں جا سکتا تھا۔ عشا کی نماز میں شریک ہونے کی اجازت بھی اِس لیے دی گئی تھی کہ اُس زمانے میں بجلی کی روشنی نہیں ہوتی تھی، اس لیے پیچھے کی صفوں میں کھڑی ہونے والی عورتیں چھپی رہتی تھیں۔ پھر حکم یہ تھا کہ نماز ختم ہونے کے بعد مرد بیٹھے رہیں اور جب عورتیں چلی جائیں اُس وقت اُٹھیں۔ جس مذہب کی یہ تعلیمات ہوں اس کے متعلق آپ یہ پوچھتے ہیں کہ وہ عورتوں اور مردوں کے مخلوط اجتماعات کی اجازت دیتا ہے؟ اب اگر آپ ایسی جگہ آ گئے ہیں جہاں اِس غلط طریقے کا رواج عام ہے تو خدا کے لیے جو کچھ آپ کو کرنا ہے کریں، اس کو اسلامی تعلیم بنا کر پیش کرنے کی کوشش نہ کریں۔ شریعت کے تابع آپ نہیں رہ سکتے تو شریعت کو اپنا تابع تو نہ بنائیں کہ جو کچھ آپ کرتے جائیں، شریعت بھی اس کی اجازت دیتی چلی جائے۔ مغرب کی اس سوسائٹی کے رنگ ڈھنگ آپ کو اختیار کرنے ہیں تو کیجیے مگر اپنے آپ کو گناہگار سمجھ کر کیجیے۔

اسی پچھلے سوال کے سلسلے میں ایک اور بات آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔ اگر یہ سوال کوئی شخص مجھ سے پاکستان میں یا کسی دوسرے مسلمان ملک میں کرتا تو اس کی وجہ کچھ سمجھ میں بھی آسکتی تھی۔ لیکن یورپ، امریکہ یا کینیڈا میں جو لوگ رہتے ہیں ان کا ایسے سوال کرنا بہت ہی عجیب معلوم ہوتا ہے۔ آپ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ اختلاطِ مرد و زن کیا رنگ دکھا رہا ہے۔ کیسی کیسی اخلاقی خرابیاں یہاں اُمنڈ رہی ہیں۔ کس طرح خاندانی نظام تباہ ہو رہا ہے۔ کس طرح اسقاطِ حمل (ABORTION) کا رواج بڑھ رہا ہے، اسے قانونی جواز عطا کیا جا رہا ہے اور کہا جا رہا ہے کہ عورت کو اس کا ویسا ہی حق ہے جیسا ایک دانت نکلوانے کا اسے حق ہے۔ کس طرح نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ خواہشاتِ نفس کو پورا کرنے کی جو طبعی صورتیں تھیں ان سے لوگوں کے دل بھر گئے ہیں اور اب وہ طرح طرح کے گھناؤنے خلافِ فطرت افعال (PERVERSIONS) کی طرف مائل ہوتے جا رہے ہیں، بلکہ اس قسم کے افعال بھی بے تحاشا وبا کی طرح پھیل رہے ہیں۔ عریانی کس شدت سے بڑھ رہی ہے۔ نیم برہنہ نوجوان جوڑے کس بے شرمی کے ساتھ برسرِعام بوس و کنار کر رہے ہیں۔ حرامی بچوں کی تعداد کس رفتار سے بڑھ رہی ہے اور حلالی بچوں کی پیدائش کو کس طرح روکا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد تو آپ کو سمجھنا چاہیے تھا کہ آپ کے اوپر خدا اور رسول کا یہ احسان عظیم تھا کہ اُس نے اخلاقی تباہی کے

اِس گڑھے میں گرنے سے پہلے ہی اُس راستے کے اولین قدم پر آپ کو روک دیا جو اس گڑھے کی طرف لے جانے والا تھا۔ یہاں جو شخص اختلاطِ مرد و زن کے جواز کا فتویٰ پوچھتا ہے، مجھے اس پر سخت حیرت ہوتی ہے۔

سوال نمبر ۱۲ - فلاحی ریاست کا اسلامی تصور

"اسلام میں محاصل (TAXATION) کا کیا تصور ہے؟ ایک فلاحی ریاست اسلام کا معاشی نظام اختیار کرنے کے بغیر نہیں بن سکتی۔ مگر جماعت اسلامی نے اس کو کبھی نمایاں کر کے پیش نہیں کیا۔"

جواب:- میں نہیں سمجھتا کہ جن صاحب نے یہ سوال کیا ہے انہوں نے میری اور جماعت اسلامی کی شائع کردہ کتابوں اور جماعت کے منشور کو کبھی دیکھا ہے۔ اگر انہوں نے یہ چیزیں دیکھی ہوتیں تو شاید یہ بات نہ کہتے کہ جماعت نے اسلام کے معاشی نظام کو پیش نہیں کیا ہے اور نہ یہ بتایا ہے کہ اسلام کس طرح ایک فلاحی ریاست (WELFARE STATE) بناتا ہے۔ ان کی غلط فہمی رفع کرنے کے لیے میں عرض کرتا ہوں کہ ہم نے وضاحت کے ساتھ یہ بیان کیا ہے کہ اسلام ہی ایک صحیح قسم کا ویلفیئر سٹیٹ بنا سکتا ہے۔ ایک ویلفیئر سٹیٹ تو وہ ہوتا ہے جس میں لوگوں کو کسی قسم کی اخلاقی تعلیم و تربیت نہیں دی جاتی۔ ان کو کسی قسم کی صحت مند روحانی غذا نہیں ملتی۔ ان کو صحیح معنوں میں انسان بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی۔ البتہ اس امر کی کوشش کی جاتی ہے کہ ان کی تمام ضروریات کو سٹیٹ پورا کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گیا ہے کہ جب ان کی تمام ضروریات سٹیٹ پوری کر دیتا ہے تو اس کے بعد ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اب وہ اور کیا کریں۔ پھر وہ بے مقصد عیش کی زندگی سے اُکتا کر طرح طرح کی بدراہیوں اور بدکرداریوں پر اُتر آتے ہیں۔ اور جب ان سے بھی دل بھر جاتا ہے تو نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ وہ خودکشی کرنے لگتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ آج جو بڑے بڑے ویلفیئر سٹیٹ ہیں ان میں خودکشی کی شرح کیا ہے؟ اگر یہ ویلفیئر سٹیٹ واقعی آدمی کو مطمئن کر دیتا ہے تو اس کو خودکشی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس سے معلوم ہوا کہ محض دنیوی سامانِ عیش کی فراوانی انسان کو اطمینان نہیں بخش سکتی۔ انسان صرف روٹی سے نہیں جی سکتا۔ اس کے قلبی اطمینان کے لیے اور اس کے ذہنی سکون کے لیے مادی خوشحالی کے علاوہ بھی کوئی چیز چاہیے جو یہ ویلفیئر سٹیٹ پیش نہیں کر سکتا۔

پھر یہ ویلفیئر سٹیٹ آدمی کو کام چور بنا دیتا ہے۔ وہ کم سے کم کام کر کے زیادہ سے زیادہ معاوضہ لینا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے ہفتہ وار تعطیل کے لیے دو دن بھی کافی نہیں ہیں۔ تین دن ہونے چاہییں۔ بلکہ وہ ہفتے میں تین دن

ہی کام کرنا چاہتا ہے۔ دفتروں اور کارخانوں میں جاتا ہے تو ہر بہانے کام سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اخلاق کی بنیاد کے بغیر جس ویلفیر سٹیٹ کی تعمیر کی جاتی ہے وہ بالآخر اسی طرح کی خرابیوں سے دوچار ہو کر رہتی ہے۔ اس کے برعکس اسلام پہلے انسان کا اخلاق درست کرتا ہے۔ اُسے حق شناس اور فرض شناس بناتا ہے۔ اُس میں خدا ترسی اور پرہیز گاری پیدا کرتا ہے، اور پھر اس کے لیے دنیوی خوشحالی کا پورا سروسامان بہم پہنچاتا ہے۔ ایسے ویلفیر سٹیٹ میں نہ انسان کام چور بنتا ہے نہ بدکردار، اور نہ اسے کبھی خودکشی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس کی تمام جائز خواہشات اور ضروریات جب پوری کر دی جاتی ہیں تو وہ آگے بڑھ کر انسانیت کی فلاح کا کام کرتا ہے اور اپنے اوقات و وسائل زیادہ سے زیادہ نیکیوں اور بھلائیوں کے پھیلانے میں صرف کرتا ہے۔

سوال نمبر ۱۳۔ حرام و حلال گوشت کا مسئلہ

"حلال گوشت کا کیا تصور ہے؟ کیا جانور کو ذبح کرتے وقت اللہ اکبر کہنا ضروری ہے؟ اور سور کیوں حرام ہے؟ جھٹکے کا گوشت مکروہ ہے یا حرام؟ کن حالات میں مجبوری کے باعث جھٹکے کا گوشت کھایا جاسکتا ہے؟ اگر کوئی غیر مسلم اللہ اکبر کہہ کر اسلامی طریقہ سے ذبح کرتا ہے تو گوشت حلال ہوتا ہے یا حرام؟ بہت سے مسلمان جھٹکے کا گوشت کھاتے ہیں اور تاویل فرماتے ہیں کہ لقمہ کھانے سے پہلے "اللہ اکبر" کہنے سے یہ گوشت حلال ہو جاتا ہے۔ یہ بات صاف طور پر عیاں ہے کہ اگر وہ جھٹکے کے گوشت پر پورا قرآن شریف بھی ختم کرلیں تو وہ گوشت جھٹکے ہی کا گوشت رہے گا۔ راقم الحروف نے اپنے ایک بھائی کے ذریعے مفتی محمد شفیع صاحب سے دریافت کرایا تھا کہ جھٹکے کا گوشت مکروہ ہے یا حرام؟ جواب وصول ہوا، حرام ہے، اور صرف اس حد تک کھایا جاسکتا ہے کہ حیات باقی رہے"۔

جواب:۔ میں اس مسئلے کی وضاحت اُردو میں بھی کرچکا ہوں اور عربی میں بھی۔ جو اصحاب اس مسئلے کو تفصیل کے ساتھ سمجھنا چاہیں وہ اُردو یا عربی میں میرے اس مضمون کو پڑھ لیں۔ اُردو میں میری کتاب تفہیمات حصہ سوم میں یہ مضمون موجود ہے۔ اور عربی میں پہلے اس کو "المسلمون" نے شائع کیا تھا اور بعد میں وہ کتابی شکل میں بھی شائع ہوچکا ہے۔ جہاں تک میں نے قرآن اور حدیث کا مطالعہ کیا ہے، میرے علم میں ایک گوشت کے حلال ہونے کے لیے تین شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ جانور حلال قسم کا ہو نہ کہ ایسا جانور جسے شریعت میں حرام

کیا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ جانور کا گلا اس حد تک کاٹا جائے کہ اس کے دماغ کا پچھلا حصہ جسم سے منقطع نہ ہو جائے کیونکہ اگر وہ کٹ جائے تو جانور کی موت فوراً واقع ہو جائے گی اور اس کے جسم کا پورا خون باہر نہ آسکے گا بلکہ اندر ہی گوشت کے ساتھ چمٹ کر رہ جائے گا۔ لیکن اگر آدھا گلا کاٹا جائے اور پچھلے حصہ کا تعلق جسم کے ساتھ باقی رہے تو جانور تڑپے گا اور اس کے تڑپنے سے خون پورا کا پورا باہر آجائے گا اور اس کی موت خون بہنے سے واقع ہوگی۔ اس طرح اس کا گوشت خون سے پاک ہو جائے گا۔ تیسری شرط یہ ہے کہ ذبح کرتے وقت جانور پر اللہ کا نام لیا جائے۔ اللہ کا نام لیے بغیر ذبح کرنا جائز نہیں ہے جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ۔ جانور پر اللہ کا نام لینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جانور کھڑا ہے اور اس پر اللہ کا نام لے لیا جائے، بلکہ ذبح کرتے وقت اس پر اللہ کا نام لینا مقصود ہے۔ ان شرطوں سے ذبیحہ حلال ہوتا ہے۔ یہ شرطیں اگر نہ پائی جائیں تو میرے نزدیک اور علماء کی اکثریت کے نزدیک وہ حلال نہیں ہوگا۔

سور کیوں حرام کیا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ہر چیز کھانے ہی کے لیے پیدا نہیں کی ہے۔ جو لوگ سور کے متعلق یہ سوال کرتے ہیں وہ آخر دوسرے بہت سے جانوروں کے متعلق بھی کیوں نہیں پوچھتے؟ انھیں پوچھنا چاہیے کہ چوہا، بلی، گدھا، کتا، چیل، کوا، گدھ، کینچوے وغیرہ کیوں نہ کھائے جائیں؟ ظاہر ہے کہ دنیا کی ہر چیز صرف کھا لینے کے لیے نہیں ہے۔ رہا یہ سوال کہ اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر سور کی حرمت کا حکم کیوں دیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا میں بعض چیزیں تو ایسی ہیں جن کے نقصانات کو ہم خود جان سکتے ہیں اور ان کو جاننے کے لیے ہمارا علم و تجربہ کافی ہے۔ ایسی چیزوں کے استعمال سے منع کرنے کی اللہ اور رسولؐ کو کوئی ضرورت نہ تھی۔ لیکن جن چیزوں کا نقصان ہم نہیں جان سکتے اُن کے متعلق حکم دینا اللہ اور رسولؐ نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ انہیں کھانے سے پرہیز کرو۔ اب جسے اللہ اور رسولؐ پر اعتماد ہو وہ ان سے پرہیز کرے اور جسے ان پر اعتماد نہ ہو وہ جو کچھ چاہے کھاتا رہے۔

جھٹکے کے گوشت کے متعلق چونکہ حرمت کا حکم خود قرآن مجید میں ہے اس لیے اسے محض مکروہ کہنا صحیح نہیں ہے بلکہ وہ حرام ہے۔ اسے اور دوسری حرام چیزوں کو صرف ایسی حالت ہی میں کھایا جاسکتا ہے جبکہ آدمی کی جان پر بن رہی ہو اور صرف وہ حرام چیز ہی بھوک مٹانے کے لیے موجود ہو۔ ایسی حالت میں صرف جان بچانے کی حد تک اسے کھایا جاسکتا ہے۔

اگر کوئی مشرک اللہ اکبر کہہ کر اسلامی طریقہ پر ذبح کرے تو اس کا ذبیحہ حلال نہیں ہے۔ صرف اہل کتاب کا ذبیحہ حلال ہے جبکہ وہ خدا کا نام لے کر ذبح کریں اور اسلامی طریقہ پر ذبح کریں۔

سوال نمبر ۱۴۔ پاکستان سے کسی کافر ملک کی جنگ میں جماعت اسلامی کا رویّہ

"اگر پاکستان اور کسی غیر مسلم حکومت میں جنگ ہو تو کیا جماعت حکومت کی مدد کرے گی؟ اگر جواب ہاں ہے تو کس حد تک مدد کرے گی؟ کیا وہ دوسری مسلمان حکومتوں پر بھی یہ اثر ڈالے گی کہ وہ پاکستان کی مدد کریں؟"

جواب:۔ اگر کوئی غیر مسلم ملک کسی مسلمان ملک پر حملہ کرے اس صورت میں اس کی مدافعت کے لیے جنگ کرنا ہمارا دینی فریضہ ہے قطع نظر اس سے کہ مسلمان ملک کی حکومت کیسی ہی ہو۔ اس لیے کہ حکومت خواہ بری ہو یا اچھی، اگر غیر مسلم دشمن ملک کے اوپر قابض ہو جائے تو ہماری مسجدیں، ہماری عورتوں کی آبرو، ہماری جان و مال کوئی چیز بھی محفوظ نہیں رہ سکتی۔ اس لیے ہم کو اپنے دین، اپنے گھر، اپنی عزت، اپنی آبرو اور اپنے مال کو بچانے کے لیے جنگ کرنے کا حق ہے۔ ساری دنیا میں مدافعت کے اس حق کو تسلیم کیا جاتا ہے اور شریعت نے بھی اس کا حکم ہمیں دیا ہے۔ اس میں یہ بحث نہیں ہے کہ ہمارے ملک کی حکومت کیسی ہے۔ اگر کوئی فاسق و فاجر بھی حکمراں ہو تب بھی ہم اس کے ساتھ مل کر لڑیں گے اور ملک کو بچائیں گے۔ اس کے بعد جب اُس فاسق و فاجر کی خبر لینی ہوگی تو لیتے رہیں گے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک شرعی مسئلہ ہی ہے کہ کسی مسلمان ملک پر اگر کوئی غیر مسلم طاقت حملہ کرے تو دوسرے مسلمان ملکوں کو بھی اس کی مدد کرنی چاہیے۔

سوال نمبر ۱۵۔ جماعت اسلامی نے مشرقی پاکستان میں فوج کی مدد کیوں کی؟

"جماعت اسلامی نے مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کی مدد کی۔ پاکستان کی فوج نے وہاں بہت سے مظالم کیے۔ اس بنا پر کیا جماعت کو ان کے رویہ کی اخلاقی ذمہ داری قبول نہیں کرنی چاہیے؟"

جواب:۔ ہمارے پیش نظر یہ تھا کہ مشرقی پاکستان کے مسلمان، جو دو سو برس تک انگریز اور ہندو کے ہاتھوں کچلے جاتے رہے تھے، کہیں وہ پھر ہندوستان کی غلامی میں نہ چلے جائیں۔ لہٰذا ان کو بچانے کے لیے ہم نے جنگ کی۔

اور آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ جنگ ہماری جماعت کے بنگالی کارکنوں ہی نے لڑی تھی مغربی پاکستان سے جماعت کا کوئی آدمی نہ گیا تھا۔ مشرقی پاکستان میں عملاً جو صورت پیش آئی وہ یہ تھی کہ بنگالی قوم پرست مسلمان اور ہندو مل کر ایک قوم بن گئے تھے اور انہوں نے ہندوستان سے مدد لے کر پاکستان کے خلاف بغاوت کی تھی۔ اب آپ ہی بتائیں کیا ہم سے یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ ہم آنکھوں دیکھتے اس بات کو گوارا کر لیتے کہ ایک طرف اندر سے ہندو اور مسلمان بنگالی قوم پرست مل کر بغاوت کریں اور دوسری طرف باہر سے ہندوستان کے ہندو پہلے در پردہ اور پھر علانیہ ان باغیوں کی مدد کو آجائیں، اور ہم ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھے یہ تماشا دیکھتے رہیں۔ یہ بغاوت مشرقی پاکستان کے عام مسلمانوں کی نہ تھی بلکہ صرف بنگالی قوم پرست مسلمانوں اور ہندوؤں کی تھی، اور ہندوستان کی مداخلت اس کو طاقت پہنچا رہی تھی۔ اس کے کامیاب ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہونا تھا کہ وہاں سات کروڑ مسلمانوں کی آبادی غلامی کے جوئے میں کس دی جائے۔ کیا آپ کی رائے میں ہمیں اس المناک نتیجے کو رونما ہونے سے روکنے کے لیے کچھ نہ کرنا چاہیے تھا؟ اب آپ خود جا کر وہاں دیکھ لیں کہ اس نام نہاد بنگلہ دیش کی عام مسلمان آبادی کا کیا حال ہو رہا ہے۔ ان کے مذہبی مدارس تباہ کر دیے گئے۔ بکثرت بنگالی مسلمان علماء قتل کر دیے گئے۔ دینی تعلیم کے لیے قاعدے اور سیپارے تک نہیں مل رہے ہیں۔ معاشی بدحالی کا یہ عالم ہے کہ ایک مزدور کو آٹھ روپے روزانہ اجرت ملتی ہے مگر بیس روپے سے کم میں ایک دن کا کھانا میسر نہیں آتا۔ حالانکہ ایک زمانہ میں جب پاکستان تھا تو تین روپے ایک مزدور کو ملتے تھے اور وہ پیٹ بھر کے دو وقت کھانا کھاتا تھا۔ اب جا کر اہل بنگال کو اور خود بنگالی قوم پرست مسلمانوں کو معلوم ہوا ہے کہ ناجائز استحصال (EXPLOITATION) جس کا رونا وہ پاکستان کے زمانے میں روتے تھے، اصل میں کس چیز کا نام ہے اور اب انہیں کون لوٹ کھسوٹ رہا ہے۔ ہندوستان کی فوجوں نے وہاں داخل ہو کر ملک کو بے تحاشا لوٹا ہے۔ ہندو وہاں کے کارخانے اکھاڑ اکھاڑ کر لے گئے۔ لوگوں کے گھروں سے ریفریجریٹر اور ایئر کنڈیشنر تک نکال لے گئے۔ موٹریں چھین چھین کر لے گئے۔ اور اب اتنے بڑے پیمانے پہ وہاں کا خام مال ہندوستان اسمگل ہو رہا ہے کہ اس نے مشرقی پاکستان کی معیشت کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ جو نام نہاد آزادی مشرقی پاکستان کے لوگوں کو ملی ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان جب چاہے وہاں اپنی فوجیں داخل کر سکتا ہے۔ ہندوستان کی مرضی کے خلاف یہ نام نہاد بنگلہ دیش کوئی فوج، کوئی ایئر فورس اور کوئی بحری بیڑہ نہیں رکھ سکتا۔ نہ کسی سے آزادانہ تجارتی معاملات طے کر سکتا ہے۔ اپنے بنگالی مسلمان بھائیوں کو اسی انجام سے بچانے کے لیے جماعت اسلامی کے کارکنوں نے اپنی جانیں لڑا دیں اور اپنے

چھ سات ہزار سے زیادہ آدمی شہید کرا دیے۔ جو لوگ مشرقی پاکستان میں پاکستانی افواج کے مظالم کی دہائی دیتے ہیں اُن کو معلوم نہیں ہے کہ بنگالی قوم پرست مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر نہ صرف غیر بنگالی مسلمانوں پر بلکہ خود دیندار بنگالی مسلمانوں پر بھی کیسے کیسے خوفناک مظالم ڈھائے تھے۔ انہوں نے مردوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو بلا امتیاز لاکھوں کی تعداد میں قتل کیا۔ عورتوں کے ننگے جلوس نکالے اور باپوں، بھائیوں، شوہروں اور بیٹیوں کے سامنے ان کو بے حرمت کیا۔ حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کیے۔ بچوں کو قتل کر کے ان کی ماؤں کو مجبور کیا کہ ان کا خون پئیں۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ جس سرزمین میں مسلمان کافروں کے ساتھ مل کر مسلمانوں پر یہ ظلم ڈھائیں وہ سرزمین خدا کے عذاب سے کبھی نہیں بچ سکتی۔ آفرین ہے مغرب کے جھوٹے پریس پر کہ اس نے پاکستانی فوجوں کے جھوٹے سچے مظالم کا تو ڈھول خوب پیٹا، مگر بنگالی قوم پرستوں کے اِن مظالم کا کبھی ذکر تک نہ کیا۔

سوال نمبر ۱۶ - اہل کتاب کا ذبیحہ

"یہودی یا مسیحی اہل کتاب کا ذبح کیا ہوا گوشت حلال ہے یا حرام؟"

جواب:- قرآن مجید میں آپ سورۂ مائدہ کا پہلا رکوع پڑھیے، اس میں سب سے پہلے مسلمانوں سے یہ کہا گیا ہے کہ تمہارے لیے طیّبات (پاک چیزیں) حلال کی گئی ہیں۔ اس کے بعد یہ کہا گیا ہے کہ تمہارے لیے اہل کتاب کا کھانا حلال ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اہل کتاب کا طیّب کھانا ہمارے لیے حلال کیا گیا ہے نہ کہ ان کا خبیث (ناپاک) کھانا۔ اور اسی سورہ میں طیّبات کی یہ تشریح بھی کر دی گئی ہے کہ جانور حلال قسم کا ہو، اس کو صحیح طریقہ سے ذبح کیا گیا ہو اور اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ انہی شرائط کے ساتھ اہل کتاب کا کھانا ہمارے لیے حلال کیا گیا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ساتویں آٹھویں صدی تک عیسائی کم از کم شرقِ اوسط میں اسی طریقہ سے ذبح کرتے تھے، جیسا کہ حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے۔ اس لیے ان کا ذبیحہ حلال تھا۔ مگر اب چونکہ انہوں نے اس طریقہ کی پابندی چھوڑ دی ہے اس لیے ان کا ذبیحہ حلال نہیں رہا۔ البتہ مذہب کے پابند یہودیوں کے متعلق مجھے معلوم ہوا ہے کہ ان کے ہاں ذبح کرنے کا طریقہ تقریباً وہی ہے جو ہمارے ہاں رائج ہے اور وہ ذبح کرتے وقت اللہ کا نام بھی لیتے ہیں۔ اب یہ آپ لوگ خود تحقیق کر لیں کہ وہ یہاں اس طریقہ پر عمل کرتے ہیں یا نہیں۔ میں نے پاکستان میں ان کے ایک عالم سے پوچھا تھا تو اُس نے مجھے بتایا تھا کہ ہمارے ہاں بھی یہی حکم ہے کہ ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا جائے اور ہمارے ہاں ذبح کا طریقہ بھی وہی ہے جو آپ کے ہاں ہے۔ اسی بنا پر میں ان کے ذبیحہ کو حلال سمجھتا ہوں۔

مگر میں آپ سے یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر یہودیوں نے دنیا بھر کے ملکوں میں منتشر ہوجانے کے باوجود اپنے لیے کوشر (KOSHER) گوشت کا انتظام کیا اور اپنے اس حق کو تسلیم کرایا کہ وہ اپنے لیے جانور اپنے طریقے پر ذبح کریں گے، تو آخر آپ ہزاروں کی تعداد میں یہاں رہتے ہوئے اپنے لیے حلال گوشت کا انتظام کیوں نہیں کرتے اور خواہ مخواہ کی تاویلوں سے جھٹکے کے گوشت کو اپنے لیے حلال کرنے کی کوشش کیوں کرتے ہیں؟

سوال نمبر ۱۷ - اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کا مسئلہ

"کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس زمانے کے یہودی اور عیسائی اہل کتاب میں شمار ہو سکتے ہیں؟ کیا ایک مسلمان اس زمانے کی ایک یہودی یا عیسائی عورت سے شادی کر سکتا ہے؟ اگر نہیں تو آپ قرآن کی اس آیت کی کیا توجیہہ کریں گے جو اہل کتاب کی عورتوں سے شادی کرنے کو جائز قرار دیتی ہے؟"

جواب:- اس زمانے کے یہودیوں اور عیسائیوں کے مذہب میں کوئی نئی بات ایسی نہیں پائی جاتی جو نزولِ قرآن کے زمانے میں ان کے اندر موجود نہ رہی ہو۔ اس وجہ سے یہ اب بھی اہل کتاب ہی ہیں۔ رہا ان سے شادی کرنے کا تعلق تو اس کے بارے میں آپ تین باتوں کو ملحوظ رکھیں۔

ایک یہ کہ قرآن میں اجازت دی گئی ہے حکم نہیں دیا گیا ہے

دوسرے یہ کہ جن عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت دی گئی ہے ان کے لیے ایک شرط تو یہ لگائی گئی ہے کہ وہ مُحْصَنٰت (یعنی باعصمت) ہوں۔ اور دوسری شرط یہ کہ ان سے خفیہ یا علانیہ ناجائز تعلقات پیدا نہ کیے جائیں اور شادی کر کے اُن کی خاطر اپنے ایمان اور اپنی آخرت کو خطرے میں نہ ڈالا جائے۔

تیسری بات یہ ہے کہ جو کام شرعاً جائز ہیں اُن پر عمل کرنے سے پہلے آدمی کو اپنے زمانے کے حالات اور ماحول پر نگاہ ڈال کر یہ ضرور دیکھ لینا چاہیے کہ آیا اس زمانے اور اس ماحول میں یہ کام کرنے سے کوئی قباحت تو پیدا نہیں ہوگی۔ اب آپ دیکھیے کہ امریکہ، کینیڈا اور یورپ میں جو عورتیں پائی جاتی ہیں، وہ اصطلاحاً (TECHNICALLY) تو اہل کتاب ضرور ہیں، لیکن ان میں بہت کم تعداد ایسی عورتوں کی ہے جو صحیح معنوں میں اہل کتاب ہوں۔ یعنی خدا اور رسول اور کتابوں اور آخرت پر ایمان رکھتی ہوں۔ پھر جو ایسی ہیں بھی ان پر مُحْصَنٰت ہونے کا اطلاق مشکل ہی سے ہو سکتا ہے۔ اب رہا زمانے اور حالات کا معاملہ تو ان ممالک میں رہتے ہوئے کسی یہودی یا عیسائی عورت سے شادی کرنے کے معنی یہ ہیں کہ آدمی اپنے آپ کو نہیں تو اپنی آئندہ نسل کو غیر مسلم معاشرے میں

بالکل جذب ہو جانے کے خطرے میں مبتلا کر رہا ہے۔ اور اگر وہ بالفرض اُس عورت کو اپنے مسلم معاشرے میں لے بھی جائے تو اس طرح کی عورتوں میں بمشکل ایک فی صد عورت ایسی ملے گی جو اپنے آپ کو، اپنے گھر کو، اور اپنے بچوں کو اسلامی معاشرے کے آداب اور طرز زندگی میں ڈھال لے۔ اِس کے برعکس خود شوہر صاحب اُس کی خاطر اپنے پورے گھر کو ایک مغربی گھر کا نمونہ بنا لیتے ہیں اور ان کی میم صاحبہ صرف اپنے ہی گھر کو نہیں بلکہ شوہر کے خاندان اور رشتہ داروں کو بھی اسلامی طرز زندگی اور اسلامی افکار سے ہٹانے کی موجب بن جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں جذبات سے مغلوب ہو کر محض جواز کے حیلے سے عیسائی یا یہودی عورتوں سے شادی کر لینا دینی مصلحت کے بالکل خلاف ہے۔

سوال نمبر ۱۸۔ کیا اسلامی اصول حالات اور زمانے کے مطابق ڈھالے جا سکتے ہیں؟

"کیا آپ کا خیال یہ ہے کہ بعض اسلامی اصول حالات اور زمانے کے مطابق ڈھالے جا سکتے ہیں؟ آپ کا ان لوگوں کے معاملے میں کیا طرز عمل ہو گا جو ہیں تو مسلمان مگر اسلامی تعلیمات کا مذاق اُڑاتے ہیں؟"

جواب:۔ آپ نے دراصل دو سوالات کیے ہیں۔

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ حالات اور زمانے پر اسلامی اصولوں کو منطبق کرنے کا کام بچوں کا کھیل نہیں ہے، بلکہ اسلامی قانون میں گہری مجتہدانہ بصیرت رکھنے والے ہی ایسا کام کر سکتے ہیں۔ اور اکثر صورتوں میں زمانے اور ماحول کے حالات پر اُن کو منطبق کرنے کی شکل وہ نہیں ہو سکتی جو علم دین کے بغیر اِس طرح کے انطباق کی باتیں کرنے والے چاہتے ہیں۔ اگر حالات اور زمانے میں اسلام کے اصولوں کے خلاف بگاڑ پیدا ہو گیا ہو تو اسلام میں بصیرت رکھنے والا آدمی اسلامی اصولوں میں ڈھیل پیدا کرنے کے بجائے اور زیادہ سختی برتنے کی ضرورت محسوس کرے گا۔ مثلاً ابھی اہل کتاب سے شادیاں کرنے کے متعلق جو سوال مجھ سے کیا گیا تھا اس میں میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ حالات و زمانے کی رعایت سے اِس دور کی یہودی یا عیسائی لڑکیوں سے شادی کرنے کی اجازت میں نرمی کرنے کے بجائے الٹی سختی کرنے کی ضرورت ہے۔

آپ کے دوسرے سوال کا جواب قرآن مجید ہی میں دے دیا گیا ہے۔ سورۂ نساء (آیت ۱۴۰) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"جب تم سنو کہ اللہ کی آیات سے کفر کیا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اُڑایا جا رہا ہے تو ایسے

لوگوں کے پاس ہرگز نہ بیٹھو جب تک کہ وہ گفتگو کا موضوع بدل نہ دیں ۔ اگر تم نے ایسا کیا تو تم بھی انہی جیسے ہو گے"۔

سوال نمبر ۱۹ ۔ کیا شادی سے پہلے لڑکی سے تخلیہ میں ملاقات کی جا سکتی ہے؟

"کیا ایک مسلمان اُس لڑکی سے ملاقات کر سکتا ہے جس سے وہ شادی کرنا چاہتا ہو؟ اگر یہ جائز ہے تو کیا وہ تخلیہ میں اس سے مل سکتا ہے اور اس کے سرپرستوں کی اجازت کے بغیر بھی مل سکتا ہے؟"

جواب :- اسلام میں کورٹ شِپ کی کوئی جگہ نہیں ہے ۔ جس بات کی اجازت حدیث میں دی گئی ہے وہ صرف اِتنی ہے کہ لڑکی کے سرپرستوں کی موجودگی میں اس کی شکل دیکھ لی جائے ۔ تخلیے کی ملاقات، اور وہ بھی سرپرستوں کے علم و اجازت کے بغیر، اسلامی طریقہ نہیں ہے ۔ بلکہ یہ رنگ ڈھنگ امریکہ اور کینیڈا اور یورپ کے لوگوں کو ہی مبارک رہیں ۔ آپ لوگ اگر یہاں اپنی معاشی ضروریات کی خاطر آئے ہیں تو اپنے اُوپر کم از کم اتنا کرم کیجیے کہ اپنی اسلامی اقدار کو یہاں کے طور طریقوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش نہ کریں ۔

سوال نمبر ۲۰ ۔ کیا سودی قرض لے کر مکان خریدا جا سکتا ہے؟

"اس ملک میں مکان بہت مہنگے ہیں اور کرائے پر اگر آدمی لے تو وہ بھی بہت زیادہ گراں ہوتا ہے ۔ اس حالت میں کیا مکان بینک کے پاس رہن رکھ کر سودی قرضہ کے ذریعہ خریدا جا سکتا ہے؟"

جواب :- حرام و حلال کے اختیارات اگر میرے ہاتھ میں ہوتے تو میں آپ کے لیے کسی چیز کو حرام نہ رہنے دیتا ۔ لیکن یہ اختیارات تو اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں، اور میں اس کے مقرر کیے ہوئے حلال و حرام کے احکام میں کوئی رد و بدل کرنے کا مجاز نہیں ہوں ۔

رہی یہ بات کہ آپ یہاں کے حالات میں اپنے آپ کو سودی ذرائع سے مکان خریدنے پر مجبور سمجھتے ہیں، تو اپنی اس مجبوری کا فیصلہ آپ اپنی ذمہ داری پر خود کریں ۔ مجھے اِس ذمہ داری میں شریک نہ کریں ۔ آپ کو دنیا میں کم از کم مکان تو مل جائے گا، لیکن آخرت میں آپ کے ساتھ میری بھی شامت آئے گی ۔

سوال نمبر ۲۱ - سرکاری بانڈز کا حکم

"کیا گورنمنٹ کے بانڈز پر دیا جانے والا منافع بھی سود میں شمار ہوتا ہے؟"

جواب :- اس کے سود ہونے میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔

سوال نمبر ۲۲ - ایسی کمپنی کی ملازمت جو حلال و حرام دونوں قسم کے کام کرتی ہو

"کیا کسی حالت میں ایک مسلمان کسی ایسی تجارتی کمپنی میں ملازمت کر سکتا ہے جو حلال و حرام دونوں قسم کی چیزیں تیار کرتی ہو یا اُن کا بیوپار کرتی ہو؟"

جواب :- ایک غیر مسلم معاشرے اور حکومت میں رہ کر مسلمان افراد کے لیے حلال و حرام کی تمیز کرنا اور حرام سے ہر حالت میں بچنا بلا شبہ ایک سخت مشکل کام ہے، لیکن جہاں تک آپ کے امکان میں ہو آپ اپنے آپ کو حرام سے بچانے کی انتہائی کوشش کریں۔ بالفرض اگر ایسی کسی کمپنی میں نوکری کرنی ہی پڑ جائے جو حلال و حرام دونوں قسم کے کاروبار کرتی ہو تو شریعت کی رُو سے آپ کے سامنے یہاں کے حالات میں زیادہ سے زیادہ جو رعایت ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ اس کے کسی ایسے شعبے میں ملازمت کریں جو حلال قسم کا کاروبار کرتا ہو۔

سوال نمبر ۲۳ - مولود شریف اور قیام کا مسئلہ

"آپ کی رائے میں کیا مولود شریف پڑھنا جائز ہے اور کیا اس میں تعظیماً کھڑا ہونا بھی جائز ہے؟"

جواب :- مولود شریف جس چیز کا نام ہے دراصل اس سے مراد ذکرِ رسول صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم، اور سیرتِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بیان ہے۔ اس کے جائز ہی نہیں کارِ ثواب ہونے میں بھی کسی کلام کی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ اس میں غلط اور موضوع روایات بیان کرنا درست نہیں، اور مولود کی محفلوں پر اگر اعتراض ہو سکتا ہے تو اسی پہلو سے ہو سکتا ہے۔

رہا سلام کے لیے تعظیماً کھڑا ہونا تو نہ یہ فرض و واجب ہے کہ ہر آدمی کو اس پر مجبور کیا جائے اور نہ کھڑے ہونے والے کو ملامت کی جائے۔ نہ یہ حرام ہے کہ جو ایسا کرتا ہے اس کو ملامت کی جائے۔ کوئی شخص اگر عقیدت

کی بنا پر کھڑا ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن اس کے لازم اور ضروری نہ ہونے کا ثبوت تو ہم ہر روز پنج وقتہ نماز میں دیتے ہیں۔ تشہد میں اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهٗ کھڑے ہو کر آخر کون صاحب پڑھا کرتے ہیں؟ سب اس کو بیٹھ کر ہی پڑھتے ہیں اور یہ تشہد خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سکھایا ہوا ہے۔ اس لیے جو لوگ اس کے ضروری ہونے پر زور دیتے ہیں ان کو بھی اپنے مبالغے سے باز آجانا چاہیے کیونکہ شریعت میں اس کے لزوم کا کوئی ثبوت نہیں۔

سوال نمبر ۲۴۔ کیا ہر اسلامی اصول منطقی دلائل سے صحیح ثابت کیا جاسکتا ہے؟

"کیا ہر اسلامی اصول کی خالص منطقی طریقے سے توجیہہ کی جاسکتی ہے؟ اگر نہیں تو کیا بعض اسلامی اصول محض اندھے ایمان کی بنا پر ماننے کے لیے ہیں؟ آپ منطقی طریقے سے آخر تقدیر کی کس طرح تشریح کریں گے؟"

جواب:۔ اسلام کا کوئی اصول یا عقیدہ یا حکم غیر معقول نہیں ہے۔ ہر ایک کو عقلی اور خالص منطقی طریقے سے سمجھایا جاسکتا ہے۔ ہمیں مسلمان ہونے کے لیے کہیں بھی اندھے ایمان کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ آپ نے تقدیر کا مسئلہ اپنے نزدیک یہ سمجھتے ہوئے چھیڑا ہے کہ اس مسئلہ میں منطق بالکل نہیں چل سکتی۔ لیکن براہ کرم میری کتاب "جبر وقدر" اور میری تفسیر تفہیم القرآن کی ہر جلد کے انڈکس میں لفظ "تقدیر" نکال کر وہ تمام مقامات دیکھ لیجیے جہاں میں نے اس مسئلہ کی تشریح کی ہے۔ اس کے بعد آپ مجھے ضرور بتائیے گا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کی پیشگی تقدیر کا طے ہونا زیادہ معقول ہے یا طے نہ ہونا زیادہ معقول ہے؟ کیا آپ ایسے خدا پر ایمان لاسکتے ہیں جس کو اپنی خدائی میں پیش آنے والے کسی واقعہ کا ایک لمحہ پہلے تک بھی علم نہ ہو اور جب کوئی واقعہ پیش آجائے تب اسے پتہ چلے کہ میری خدائی میں یہ کچھ ہو گیا؟ کیا واقعی ایسا خدا اس عظیم کائنات پر حکومت کرسکتا ہے؟

خطاب

میں آپ کے سوالات کے جوابات دے چکا ہوں۔ اب میں اختصار کے ساتھ خود بھی کچھ آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ آپ اِس سرزمین میں مختلف مقاصد کے لیے آئے ہیں۔ کوئی آپ میں سے علم حاصل کرنے یا کوئی فن سیکھنے کے لیے آیا ہے۔ کوئی اپنی معاش کی فکر میں آیا ہے۔ اور کچھ ایسے لوگ ہیں جو یہیں رہ بس گئے ہیں۔ لیکن

ان سب چیزوں کے ساتھ آپ کی ایک حیثیت اور بھی ہے اور وہ ہے آپ کے مسلمان ہونے کی حیثیت۔ اس دوسری حیثیت میں آپ لامحالہ جہاں بھی رہیں گے اور جہاں بھی جائیں گے آپ کو اسلام کا نمائندہ ہی سمجھا جائے گا، خواہ آپ کو اس کا احساس ہو یا نہ ہو۔ ایک غیر مسلم جب بھی آپ کو دیکھے گا، یہی سمجھے گا کہ مسلمان ایسا ہوتا ہے۔ اب اگر آپ نے اپنے آپ کو ایک بُرے انسان کی حیثیت سے پیش کیا، اپنے اخلاق، اپنے معاملات اور اپنے رہن سہن کا بُرا نمونہ لوگوں کو دکھایا، یا یہاں کے عوام و خواص کو یہ تاثر دیا کہ جیسے وہ ہیں ویسے ہی آپ بھی ہیں، تو آپ اسلام کی غلط نمائندگی کریں گے اور اس صورت میں آپ کو دیکھ کر جو شخص بھی اسلام کے متعلق بُری رائے قائم کرے گا اس کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔ اس کے برعکس اگر آپ نے اپنے قول و عمل سے، اپنے اخلاق اور معاملات سے، اپنے طرزِ زندگی سے اسلام کی صحیح نمائندگی کی تو بعید نہیں کہ بہت سے لوگوں کے دل اسلام کے لیے کھل جائیں گے خواہ آپ باقاعدہ تبلیغ کا کام کریں یا نہ کریں۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ ہر مسلمان جو یہاں رہتا ہے اپنی اس حیثیت اور اس ذمہ داری کو محسوس کرے۔ آپ کی زندگی اگر ایک سچے اور پورے عملی مسلمان کی سی زندگی ہو تو آپ کا وجود ایک جیتا جاگتا اور چلتا پھرتا مبلغ بن جائے گا۔

دوسری بات میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ میں سے جو لوگ یہاں رہ پڑے ہیں وہ اپنی آئندہ نسل کی فکر کریں۔ آپ یہاں ایک مسلمان ملک اور مسلمان معاشرے سے نکل کر آئے ہیں۔ آپ نے مسلمان ماں باپ کے گھر میں آنکھیں کھولی ہیں۔ آپ نے خواہ اسلام کی تعلیم حاصل نہ بھی کی ہو تو زندگی کا ایک خاصا حصہ مسلم معاشرے میں گزارا ہے جس کے اندر رہ کر ہر شخص کچھ نہ کچھ اسلام کے متعلق ضرور جان لیتا ہے۔ اس کو سرسری ہی سہی، بہرحال اتنا ضرور علم ہوتا ہے کہ اسلامی عقائد کیا ہیں، اسلامی عبادات کیا ہیں، اسلام کی نگاہ میں کیا چیز بُری ہے اور کیا چیز اچھی، اور مسلمان کا طرزِ زندگی کیا ہے۔ لیکن آپ کی اولاد جو یہاں پرورش پا رہی ہے وہ بالکل نہیں جانتی کہ اسلام کیا ہے اور اسلامی زندگی کیا ہوتی ہے۔ اس کو اسلام کی کوئی تعلیم نہیں ملتی، اور نہ مسلم معاشرے کے طور طریقوں سے وہ واقف ہوتا ہے۔ یہاں آنکھیں کھول کر ایک بچہ ہر وقت ایک غیر مسلم معاشرے کو چلتا پھرتا دیکھتا ہے۔ یہاں کے مدارس میں جاتا ہے تو وہی تعلیم و تربیت اسے ملتی ہے جو یہاں کے بچوں اور نوجوانوں کو دی جاتی ہے۔ اس حالت میں آپ چاہے کتنا ہی زور لگالیں اپنی اولاد کو یہاں کے معاشرے، یہاں کے اخلاق و تہذیب اور یہاں کے غلط نظامِ زندگی میں جذب ہونے سے نہیں بچا سکتے۔ اس لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ جہاں بھی مسلمان کافی تعداد میں آباد ہیں وہاں وہ اپنے بچوں کی اسلامی تعلیم و تربیت کا خود انتظام کریں۔ اگر وہ اس کی ضرورت اور اہمیت کو محسوس کر لیں گے تو یہ کچھ مشکل نہیں ہے کہ مِل جُل کر ایک تنظیم قائم کریں، ایک تعلیمی فنڈ قائم کریں جس میں ہر شخص

باقاعدگی کے ساتھ اپنی استطاعت کے مطابق چندہ دے، اور اس فنڈ سے مسلمان بچوں کے لیے مدارس کھولے جائیں جن میں تعلیم اسی معیار کی ہو جو اِس ملک کا نظامِ تعلیم چاہتا ہے، مگر اس کے ساتھ دینی تعلیم و تربیت بھی دی جائے اور مسلمان بچوں کو یہاں کے نظامِ تعلیم کی گندگیوں (مثلاً جنسی تعلیم اور مخلوط تعلیم) سے محفوظ رکھا جائے۔ ان مدرسوں کے ساتھ ایسے ہوسٹل بھی قائم کیے جائیں جن میں ایسے مقامات کے لوگ اپنے بچے بھیج سکیں جہاں مسلمانوں کی تعداد اتنی کم ہے کہ وہ اپنے مدرسے قائم نہیں کر سکتے۔ میرے نزدیک کوئی وجہ نہیں ہے کہ آپ کے مدارس کو تسلیم نہ کیا جائے۔ اگر آپ یہ ثابت کر دیں گے کہ کینیڈا یا امریکہ میں تعلیم کا جو معیار ہے آپ کے مدارس اس معیار پر پورے اترتے ہیں اور آپ اس معیار کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے بچوں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینا چاہتے ہیں تو میں نہیں سمجھتا کہ آپ کے اس حق کو تسلیم کرنے سے کوئی حکومت انکار کر دے گی۔ اگر یہاں دوسرے مذہبی یا نسلی گروہوں کو اپنے مخصوص (PAROCHIAL) مدارس قائم کرنے کی اجازت دی جا سکتی ہے تو آخر آپ کو کیوں نہیں دی جا سکتی؟ شرط بس یہ ہے کہ آپ بھی اپنا حق منوانے کے لیے اسی طرح کی کوشش کریں جس طرح دوسروں نے کی ہے اور اسے منوا کر چھوڑا ہے۔ میں صاف صاف عرض کرتا ہوں کہ اگر آپ نے اس کام میں غفلت سے کام لیا تو آپ کی پہلی نسل کو تو شاید یہ یاد بھی رہ جائے کہ ان کے باپ دادا مسلمان تھے لیکن دوسری تیسری نسل تک پہنچتے پہنچتے وہ بالکل یہاں کی تہذیب اور معاشرے میں گم ہو جائیں گے اور ان کے اندر اسلام کی رمق تک باقی نہ رہے گی۔ خدا نہ کرے کہ اس حد تک نوبت پہنچے۔ اس لیے میں بڑی دل سوزی کے ساتھ آپ کو اس کام کی ضرورت و اہمیت کا احساس دلاتا ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ کینیڈا اور امریکہ میں رہنے والے مسلمان اس میں کسی تساہل اور تاخیر سے کام نہ لیں گے۔

وَاٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

(بقیہ اشارات) اور جب قوم اس صورت حال پر احتجاج کرنے کی کوشش کرتی ہے تو اس کے کان میں یہ پھونک دیا جاتا ہے کہ تم ذرا صبر کر کے آمر کے کارناموں کے ثمرات تو دیکھو، تمہارے سارے مسائل ابھی حل ہوا چاہتے ہیں۔

مکر و فریب کی اس پالیسی کو کامیاب بنانے کے لیے دنیا کا ہر آمر اس بات کا خاص طور پر اہتمام کرتا ہے کہ اس کے مقابلے میں کوئی دوسری شخصیت اُبھرنے نہ پائے اور لوگ اگر کسی مرحلہ پر اس سے بدظن بھی ہو جائیں تو متبادل قیادت کے یکسر ناپید ہونے کی وجہ سے اس کی غلامی کو ایک ناگزیر ضرورت سمجھتے ہوئے اس کے تحت بے چارگی کے عالم میں زندگی بسر کرتے رہیں۔ چنانچہ ہر آمر جہاں اپنی شخصیت کے اندر مصنوعی رنگ بھر کر اسے پوری قوت اور چابکدستی سے اُبھارتا ہے وہاں ہر ایسے شخص کے منہ پر کالک لگاتا ہے جس کے بارے میں اسے اس بات کا کوئی معمولی خدشہ بھی ہوتا ہے کہ وہ کسی وقت عوام کی توجہ کا مرکز بن سکتا ہے۔ وہ اپنی ذات کے علاوہ قائدانہ صلاحیتیں رکھنے والے ہر شخص کو ملت کا غدار اور وطن کا دشمن قرار دیتا ہے اور اس بات کی پوری کوشش کرتا ہے کہ یہ شخص عوام کے اندر بالکل رسوا اور بدنام ہو کر رہ جائے اور وہ اس سے اس طرح نفرت کرنے لگیں جس طرح کہ قومیں غداروں سے کرتی ہیں۔ آمر کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اس سے اختلاف رکھنے والے رہنماؤں کی ملک کے اندر اور باہر جس قدر ساکھ گرے گی اسی تناسب سے اس کی فرمانروائی کا تحفظ ہوگا۔ مگر آمر کا یہ خود غرضانہ طرزِ عمل قوم کی بربادی کا سبب بنتا ہے۔ جب عوام کے ذہنوں میں یہ خیال راسخ ہو جائے کہ جس قوم سے وہ تعلق رکھتے ہیں وہ قیادت کے اعتبار سے بانجھ ہے اور تھوڑے سے جو لوگ اپنے اندر اس قسم کی صلاحیتیں رکھتے ہیں وہ سب غدار اور قومی مفاد کے دشمن ہیں اور لے دے کر اس پورے ویرانے میں صرف ایک ہی سایہ دار درخت ایسا موجود ہے جس کے سائے میں پناہ لے کر وہ امن و سکون کی زندگی بسر کر سکتے ہیں تو ایسے افراد کا اپنے مستقبل سے مایوس ہونا بالکل فطری امر ہے۔ وہ اگر جھوٹے پراپیگنڈے سے متاثر ہو کر آمر مطلق کے فیوض و برکات کے معترف بھی ہوں لیکن انہیں یہ احساس ہمیشہ پریشان کرتا ہے کہ یہ صاحب جن کے ہاتھ میں ان کی زمام کار ہے وہ اپنی ساری خوبیوں اور غیر معمولی صلاحیتوں کے باوجود بہرحال فانی انسان ہیں اور انہیں ایک نہ ایک دن اس دنیا اور تخت و تاج کو خیرباد کہنا ہی ہے۔ اور جب وہ دنیا میں موجود نہ ہوں گے تو پھر ان کا کیا بنے گا۔ مایوسی کی اس فضا میں جب آمر دنیا سے رخصت ہوتا ہے یا مسندِ اقتدار چھوڑنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے تو پوری قوم اپنے آپ کو ایک خوفناک قسم کے ذہنی خلا میں گھری ہوئی پاتی ہے جس میں اس کی ساری قوتیں ٹھٹھر کر رہ جاتی ہیں۔

جمہوریت میں ہزار خامیاں ہی سہی لیکن اس میں قیادت کا فقدان کسی مرحلے پر محسوس نہیں کیا جاتا۔ بلکہ جمہوری عمل کے ذریعے متبادل قیادت خود بخود تیار ہوتی رہتی ہے اور جب قوم قائدین کے ایک گروہ سے بیزاری کا اظہار کرتی ہے تو دوسرا گروہ اس کی جگہ لینے کے لیے ہر لحاظ سے تیار ہوتا ہے۔ اس بنا پر قیادت کا آرزومند ہر گروہ اپنے اندر بہتر سے بہتر افراد جذب کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اقتدار حاصل ہوجانے کے بعد وہ عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کرکے اپنے حامیوں کو ہی نہیں بلکہ اپنے مخالفین کو بھی مطمئن کرسکے۔

جمہوریت کے مقابلے میں آمریت اپنے اردگرد ان لوگوں کو جمع کرتی ہے جو آمر کے سامنے بالکل بونے نظر آئیں اور اس طرح ان کے درمیان آمر کا قد کاٹھ غیر معمولی طور پر نمایاں ہو۔ جس شخص کو آمریت کا لپکا ہو وہ ہمیشہ قابل، دیانت دار، باضمیر اور عقل و دانش رکھنے والے لوگوں کو اپنے پاس سے دُور رکھنے کی کوشش کرتا ہے بلکہ ان کی تذلیل و تضحیک میں اپنی قوتیں صرف کرتا رہتا ہے اور ان کے برعکس اپنے گرد آبرو باختہ، بے ضمیر، بددیانت اور عقل و فکر سے عاری لوگوں کی بھیڑ جمع کرتا ہے تاکہ ان کی اخلاقی کمزوریوں اور فکری اور عملی کوتاہیوں سے بوقت ضرورت فائدہ اُٹھایا جاسکے۔ جمال عبدالناصر کے دست راست عبدالحکیم عامر نے آمرانہ ذہن کی اس فطری کمزوری کے یوں تو متعدد واقعات بیان کیے ہیں مگر اس میں ایک واقعہ بڑا دلچسپ ہے۔ اس کا بیان ہے کہ جب اس کا ممدوح جمال عبدالناصر مصر پر پوری طرح مسلط ہوگیا تو اُس نے ایک دن پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ اُسے کہا کہ حضور ہم نے عوام سے یہ وعدہ کیا تھا کہ ہم تخت اقتدار پر متمکن ہونے کے بعد انتظامیہ کو ہر قسم کی آلائشوں سے پاک کرلیں گے اور ہمارا حال یہ ہے کہ امور مملکت چلانے والے ہمارے قریبی ساتھی ہر قسم کی دھاندلیاں کر رہے ہیں اور ہم خاموش تماشائی کی حیثیت سے اُن کی ناجائز کارروائیوں کو دیکھنے میں مصروف ہیں۔ آپ ان کے خلاف کیوں کوئی موثر قدم نہیں اُٹھاتے؟ جمال عبدالناصر، عبدالحکیم عامر کی یہ باتیں کچھ دیر تک توجہ سے سنتا رہا پھر توقف کے بعد کہنے لگا "عبدالحکیم! انھیں یہ ناجائز کام کرنے دو کیونکہ ان ناجائز کاموں کے بعد وہ مجھ سے آنکھیں تو چار نہ کرسکیں گے۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں ان لوگوں کو ہٹا کر اپنے ساتھ ایسے افراد شامل کرلوں جو ایماندار ہونے کی وجہ سے کوئی غلط کام کرنے پر آمادہ نہ ہوسکیں۔ عامر! ایماندار شخص بڑا بے لچک ہوتا ہے اور وہ کوئی غلط بات گوارا نہیں کرسکتا! مجھے سلطنت کا کاروبار چلانا ہے۔

مطبوعات

MODERNIZATION
MENACES
MUSLIMS
عملِ تجدید مسلمانوں کو خطرہ پیش کرتا ہے

تالیف : جناب اسلم صدیقی صاحب
شائع کردہ : شیخ محمد اشرف کشمیری بازار لاہور
صفحات : ۲۹۶
قیمت : -/۳۰ روپے

زیر تبصرہ کتاب جدید عمرانیات کے ایک عالم کی کاوشِ فکر کا نتیجہ ہے۔ فاضل مصنف نے بڑی تفصیل کے ساتھ ان معاشرتی، معاشی اور سیاسی مسائل کا ذکر کیا ہے جو ان کے خیال میں دورِ جدید کی پیداوار ہیں۔ پھر انہوں نے اس امر سے بھی بحث کی ہے کہ کس طرح اِن خارجی تبدیلیوں نے مسلمانوں کو زندگی کے مختلف شعبوں میں متاثر کیا ہے اور اس بات پر خاص طور پر زور دیا ہے کہ مسلمان عصری تقاضوں یا دورِ جدید کے اجتماعی عوامل کو نظر انداز کر کے آگے نہیں بڑھ سکتے اور اگر انہوں نے اسے پس پشت ڈالنے کی کوشش کی جیسا کہ وہ پہلے کرتے رہے ہیں تو رہوارِ زمانہ انہیں گرد کی طرح پیچھے پھینک دے گا۔ حالات کا یہ تجزیہ اگرچہ کافی حد تک درست ہے لیکن اس میں مغرب سے ذہنی مرعوبیت پوری طرح جھلکتی ہے۔ تشخیص مرض سے گزر کر امت کی اصلاح کے لیے جو نسخہ تجویز کیا جاتا ہے وہ ہمارے نزدیک اس قوم کے لیے مہلک ہے۔ صاحب دل مصنف نے اس معاملے میں ان تجدد پسندوں کا انداز فکر اختیار کیا ہے جو اسلامی تعلیمات کو توڑ موڑ کر عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے بعض ایسی سطحی باتیں بھی کی ہیں جو ان جیسے صاحب علم کے معیار سے فروتر نظر آتی ہیں۔ خصوصاً کتاب کے نویں باب میں انہوں نے سیدنا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں جو باتیں منسوب کی ہیں وہ صحیح نہیں۔

کتاب کے فاضل مصنف اضطرار اور باطل کے ساتھ مفاہمت کے درمیان جو بیّن فرق ہے اسے بھی نظر انداز کر گئے ہیں اور ہر غلط بات کو اضطرار کی بنیاد پر مسلم قوم کو قبول کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ معلوم نہیں کہ انہوں نے معروف کی یہ تعریف کہ ہر وہ فعل جس سے قوم کو غالب معاشرتی حالات سے سازگاری پیدا کرنے میں مدد ملے وہ معروف ہے کہاں سے اخذ کیا ہے۔ کتاب کا معیار طباعت و کتابت عمدہ ہے اور انگریزی زبان شائستہ اور زوردار ہے مگر انداز فکر وہی ہے جو اس ملک کے عام تجدد پسندوں کا ہے۔